تعمیر انسانیت

انسانیت کی تعمیر میں اسلام کا حصہ

مولانا وحید الدّین خاں

تعمیر انسانیت

انسانیت کی تعمیر میں اسلام کا حصہ

Tameer-e-Insaniyat
By Maulana Wahiduddin Khan

First Published 1999
Reprinted 2006

Goodword Books Pvt. Ltd.
A-21, Sector 4, Noida - 201 301
email: info@goodwordbooks.com

Printed in India

فہرست

بسم الله الرحمن الرحيم

باب اول

انسان پیدائشی طور پر ایک دین کی تلاش میں ہے۔ اس کے اردگرد کی دنیا میں یہ دین خاموشی کی زبان میں ہے۔ اور خدا کی کتاب قرآن میں یہ دین نطق کی زبان میں ہے۔

انسان کی تلاش

انسانی تاریخ ایک مسلسل تلاش کا نام ہے۔ انسان کی تاریخ جتنی قدیم ہے اتنی ہی قدیم اس کی تلاش بھی ہے۔ مگر بے شمار علمی اور تمدنی ترقیوں کے باوجود ابھی تک انسان اپنی تلاش کا جواب نہ پاسکا۔ انسانیت کا قافلہ بدستور تلاش کے صحرا میں حیران وسرگرداں دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت کی یہ تلاش سب سے پہلے فلسفیوں نے باقاعدہ صورت میں شروع کی۔ ہزاروں بڑے بڑے دماغوں نے اپنی پوری زندگی اسی تلاش میں ختم کردی۔ مگر وہ کسی قابل اعتماد جواب تک نہ پہونچ سکے۔ انگریز فلسفی برٹرینڈ رسل (وفات ۱۹۷۰) نے بیسویں صدی کا اعلیٰ ترقی یافتہ زمانہ پایا۔ وہ تقریباً سو سال تک زندہ رہا۔ اس نے اپنی ساری عمر علوم کے مطالعہ میں گزار دی۔ اس کے باوجود وہ اس حال میں مرا کہ وہ دنیا کو کوئی فلسفۂ حیات نہ دے سکا۔ چنانچہ برٹرینڈ رسل کو بے فلسفہ فلسفی (Philosopher of no Philosophy) کہا جاتا ہے۔

تاہم یہ صرف برٹرینڈ رسل کی بات نہیں بلکہ دنیا بھر میں پیدا ہونے والے تمام فلسفیوں کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی فلسفی انسان کو اس کی تلاش کا کوئی واضح جواب نہ دے سکا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر پچھلے پانچ ہزار سال میں فلسفہ اپنی تلاش کا جواب پانے میں ناکام رہا ہے تو اگلے پانچ ہزار سال میں وہ اس کو پانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ تلاش کی مدت کا نہیں ہے بلکہ تلاش کے معاملہ میں فلسفہ کی نااہلی کا ہے۔

حقائق کی دنیا اتنی زیادہ وسیع ہے کہ انسان اپنے محدود ذہن کے تحت اس کا احاطہ ہی نہیں کر سکتا۔ ایک مغربی مفکر نے بجا طور پر کہا ہے کہ علم میں ہر اضافہ صرف اپنی بے علمی میں اضافہ کے ہم معنی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان رہے ہیں:

We are knowing more and more about less and less

فلسفہ کے بعد اس معاملہ میں دوسرا نام سائنس کا آتا ہے۔ مگر سائنس نے آغاز ہی میں

اس معاملے میں اپنے عجز کا اعتراف کر لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس کی معروف ترقیاں تمام تر اسی اعترافِ عجز کا نتیجہ ہیں ۔ فلسفہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ چیزوں کا علم (knowledge of things) اور سچائیوں کا علم (knowledge of truths) دونوں کو بیک وقت دریافت کرے۔ مگر سائنس نے پیشگی طور پر یہ مان لیا کہ سچائی کے علم تک پہونچنا انسان کے لئے اپنی ناکافی استعداد کی بنا پر ممکن ہی نہیں۔ اسی بات کو قرآن میں اس طرح بتایا گیا ہے کہ " انسان کو صرف علم قلیل دیا گیا ہے "۔ (بنی اسرائیل ۸۵)

چنانچہ عملی نقطۂ نظر کو اختیار کرتے ہوئے سائنس نے اپنی کوششوں کو صرف چیزوں کے علم تک محدود کر دیا۔ اس تقسیم کی بنا پر سائنس کو جزئی کامیابی تو ملی۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حقیقت کی تلاش کے معاملہ میں سائنس کوئی مفید علمی ذریعہ نہیں ہے اور نہ وہ کبھی اس کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

فلسفہ اور سائنس کے بعد دوسرا جو ذریعہ باقی رہتا ہے وہ مذہب ہے۔ فلسفہ اور سائنس کے برعکس، مذہب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کے پاس حقیقت کا علم ہے اور لوگوں کو اس کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ دنیا میں تقریباً ایک درجن بڑے مذاہب ہیں اور ہر ایک کا دعوی یہی ہے۔ مگر مسلّمہ اصول کے مطابق، کسی مذہب یا فکری نظام کو صرف دعویٰ کی بنیاد پر نہیں مانا جاسکتا۔ ضروری ہے کہ مسلمہ علمی اصول پر ان کے دعویٰ کو جانچا جائے اور پھر کوئی فیصلہ کیا جائے۔

اب غور کیجئے کہ اس جانچ کا علمی اصول کیا ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذاہب کی واقعیت کو جانچنے کے لئے تین بنیادی اصول یہ ہو سکتے ہیں۔

۱۔ زیر بحث مذہب کے حق میں تاریخی قرائن کیا ہیں۔ کیا تاریخ کے مسلمہ معیار پر اس کے وجود کی اعتباریت ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ صرف غیر ثابت شدہ مفروضات پر مبنی ہے یا وہ اپنے ساتھ کوئی حقیقی تاریخ رکھتا ہے۔

۲۔ مذہب کے دائرہ سے باہر علوم کا جو ارتقاء ہوا ہے وہ اس کی تعلیمات کی تصدیق کرتا

ہے یا وہ اس کی تردید کر رہا ہے۔ ثابت شدہ علوم اس کے موافق ہیں یا اس کے خلاف۔

۳۔ اس کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے لئے کیا ایسی کوئی اسکیم ہے جو ابدی طور پر قابل عمل ہو اور جس کی افادیت کا عملی ثبوت بھی موجود ہو۔

ایک جائزہ

اب مذکورہ اصولوں کی روشنی میں مختلف مذاہب کا ایک مختصر جائزہ لیجئے۔ اس سلسلہ میں پہلا معیار تاریخی معیار ہے۔ اس معیار کی روشنی میں دیکھا جائے تو اسلام کے واحد استثناء کو چھوڑ کر تمام معروف مذاہب خالص تاریخی معیار پر غیر مستند قرار پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوازم میں رام کو ایک راجہ کا بیٹا بتایا گیا ہے۔ مگر معلوم تاریخی ریکارڈ میں ایسے کسی راجا یا راجا فیملی کا کوئی ثبوت نہیں۔ اسی طرح کرشن کو ایک بڑی جنگ کے کرداروں میں سے ایک کردار مانا گیا ہے۔ مگر خالص تاریخ کے اعتبار سے ایسی کسی جنگ کا ثبوت نہیں ملتا۔ اسی طرح گوتم بدھ کی طرف کچھ تعلیمات منسوب کی جاتی ہیں۔ حالانکہ آج تک یہ ثابت نہیں کہ گوتم بدھ کون سی زبان بولتے تھے۔ اسی طرح ویدوں کو ہندوازم کی مقدس کتاب مانا جاتا ہے۔ مگر ویدوں کی تاریخ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ خالص تاریخی ماخذ کی بنیاد پر کوئی نہیں بتا سکتا کہ وید کب لکھے گئے اور ان کے لکھنے والے کون تھے۔

حضرت مسیح کے پیغمبر ہونے کی اصولی تصدیق قرآن سے معلوم ہوتی ہے۔ مگر فلسطین اور شام کی باقاعدہ تاریخ میں ان کا کوئی حوالہ موجود نہیں۔ حضرت مسیح کا کچھ ترجمہ شدہ کلام نئے عہد نامہ (انجیل) کی صورت میں آج موجود ہے۔ مگر اس کو معتبر نہیں کہا جا سکتا۔ حتی کہ اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ حضرت مسیح نے کس زبان میں کلام کیا تھا۔ کیونکہ اس وقت فلسطین کے علاقہ میں کئی زبانیں رائج تھیں۔ مثلاً رومی اور عبرانی وغیرہ۔

یہی معاملہ اسلام کے سوا تمام مذاہب کا ہے۔ یہ مذاہب خالص تاریخی طور پر غیر معتبر ہیں۔ اور جو مذہب تاریخی اعتباریت (historical credibility) نہ رکھتا ہو وہ خالص علمی اعتبار

سے زیر بحث آنے کی پوزیشن ہی میں نہیں۔

اب دوسرے معیار کے پہلو سے دیکھئے۔ یہاں بھی پہلے ہی جیسا معاملہ ہے۔ اسلام کے سوادوسرے بڑے مذہبوں میں سے کوئی بھی مذہب اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ مثال کے طور پر ہندوازم کی مقدس کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ ستارے انسان کی قسمت پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ مگر سائنسی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اسی طرح ہندو مذہب کے مقدس بزرگ یدھشتر کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ان کی سچائی کی بنا پر ان کا رتھ زمین کے اوپر چلتا تھا اور ایک بار جب وہ جھوٹ بولے تو ان کا رتھ نیچے گر کر زمین پر آگیا۔ لیکن زمین کا سائنسی مطالعہ یہ ثابت نہیں کرتا کہ سچ یا جھوٹ زمین کی قوتِ کشش پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

اسی طرح اکثر غیر اسلامی مذاہب میں یہ مانا گیا ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں خدا کے وجود کا حصہ ہیں۔ یہ خود خدا ہے جو مختلف اشیاء کی صورت میں اپنا ظہور دکھا رہا ہے۔ تمام چیزیں خدا کے وجود کا انش ہیں۔ مگر علمی تجزیہ سے یہ نظریہ ثابت نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر کائنات کی مختلف موجودات کا حال یہ ہے کہ ان کو کاٹا جاسکتا ہے، ان کو جلایا جاسکتا ہے، ان کو مختلف صورتوں میں بدلا جاسکتا ہے۔ اب یہ بات ناقابل تصور ہے کہ جو چیزیں خدا کے وجود کا حصہ ہوں ان کے اوپر اس طرح انسانی عمل جاری ہوسکے۔

تیسرے معیار پر بھی اسلام کے سوا کوئی مذہب پورا نہیں اترتا۔ اسلام کے سوا دوسرے تمام مذاہب ناقابل عمل اور غیر مفید تعلیمات سے بھرے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر جین مذہب اور بدھ مذہب میں سب سے بڑا گناہ جان کو مارنا ہے اور سب سے بڑی نیکی جان کو بچانا۔ یہاں تک کہ جین مذہب کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ رام اور کرشن نرک میں گئے، کیوں کہ انھوں نے تلوار اور تیر کمان کے ذریعہ جان کو مارا تھا۔

بدھ مذہب اور جین مذہب کا یہ عقیدہ اس معنی میں نہیں ہے کہ ظلم اور زیادتی کے طور پر کسی کو نہ مارا جائے۔ بلکہ ان کے عقیدہ کے مطابق، مطلق طور پر ہی جان کو مارنا ناقابل معافی گناہ

ہے، نہ چھوٹی جان کو اور نہ بڑی جان کو۔ مگر جدید دریافتوں کے بعد یہ نظریہ سراسر ناقابل عمل ثابت ہوچکا ہے۔ مثال کے طور پر ہماری زمین میں کئی حصے ایسے ہیں جہاں غیر لحمی خوراک سرے سے قابل حصول ہی نہیں یا بہت کم قابل حصول ہے۔ ایسی حالت میں اس قسم کا مذہب تمام انسانوں کا مذہب نہیں بن سکتا۔

مزید یہ کہ جدید سائنسی انکشافات نے اس قسم کے عقیدہ کو سراسر بے بنیاد ثابت کردیا ہے۔ مثال کے طور پر جدید مطالعہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ زندگی کا تعلق صرف انسان اور حیوان ہی سے نہیں بلکہ پانی، دودھ، سبزی اور پھل جیسی چیزوں میں بھی بڑے پیمانے پر زندگی پائی جاتی ہے۔ حتی کہ ہوا میں بھی کثیر تعداد میں زندہ اجسام موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کرنے والے یا گوشت کھانے والے لوگ ہی زندگی کو مارنے کے مجرم نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ بھی ہر لمحہ بے شمار زندگیوں کو ہلاک کررہے ہیں جو اپنے خیال کے مطابق سبزی خور ہیں۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مذاہب جدید علمی ترقیوں کے معیار پر اپنی صداقت کو باقی رکھنے میں ناکام ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا کوئی قابل عمل نقشہ اسلام کے سوا کسی اور مذہب میں موجود نہیں۔

اسلام ایک نعمت

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی واحد مذہب ہے جو مذکورہ تینوں معیار پر اپنی صداقت و واقعیت کو ثابت کرتا ہے۔ اسلام کے سوا دوسرا کوئی مذہب نہیں جو ان تینوں قسم کی جانچ میں پورا اترے۔ پہلے معیار کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام پورے معنوں میں ایک تاریخی مذہب ہے۔ اس کے تمام اجزاء خالص تاریخ کے علمی معیار پر پورے اترتے ہیں۔

اسی طرح اسلام کے بعد سائنس کا ظہور ہوا اور ہزاروں حقائق سامنے آئے جو اس سے پہلے انسان کو معلوم نہ تھے۔ مگر کوئی بھی نئی تحقیق اسلام کی پچھلی تعلیم کی علمی معقولیت کو مشتبہ نہ کرسکی۔ بعد کی سائنسی دریافتیں اسلام کے بیانات کی صرف علمی تصدیق بنتی چلی گئیں نہ کہ ان کی تردید۔

اسی طرح تمام مذاہب میں اسلام ہی واحد مذہب ہے جس کا بتایا ہوا نظام ہر دور میں قابل عمل ہے۔ اسلامی نظام کا کوئی بھی جزء بعد کو ظاہر ہونے والی حقیقتوں سے نہیں ٹکراتا۔ مزید یہ کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی پشت پر انسانی زندگی کا ایک مکمل اور ثابت شدہ نمونہ موجود ہے۔ کسی بھی دوسرے مذہب کی تاریخ میں اس قسم کا عملی نمونہ نہیں پایا جاتا۔

اسلام کی یہ خصوصیت صرف اسلام کو ماننے والوں کا اپنا عقیدہ نہیں۔ وہ ایک ایسا مسلّمہ واقعہ ہے کہ غیر مسلم مورخین اور اہل علم بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے نے لکھا ہے کہ تمام بڑے بڑے مذاہب میں اسلام واحد مذہب ہے جو تاریخ کے معیار پر قابل اعتماد ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر موریس بکائی نے تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ جدید سائنسی دریافتوں کے بعد تمام بڑے بڑے مذاہب غیر معتبر ثابت ہو چکے ہیں، صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیمات میں اور جدید سائنسی دریافتوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ اسی طرح سوامی وویکانند نے لکھا ہے کہ تاریخ میں صرف ایک ہی مذہب ایسا ہے جس نے انسانی اخوت اور مساوات کے اصول پر ایک عملی سماج کی تشکیل کی ہے اور وہ اسلام ہے۔

اس سلسلہ میں غیر مسلم مورخین اور محققین نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اب یہ بات صرف کسی مسلمان کا عقیدہ نہیں بلکہ وہ ایک مسلّمہ علمی حقیقت ہے۔ یہاں بطور مثال صرف چند کتابوں کے نام درج کئے جاتے ہیں۔ تفصیل کے طالب حضرات ان کتابوں کو دیکھ سکتے ہیں۔

Nishi Kant Chattopaddhyaye, *Why I have accepted Islam?*
Swami Vivekanand, *Letters of Swami Vivekanand*
M. N. Roy, *The Historical Role of Islam*
Maurice Bucaille, *The Bible, The Quran and Science*

اسلام نیا مذہب نہیں

قرآن میں مذہب کا جو تصور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ یہ ایک ہونا اس مفہوم میں نہیں ہے کہ تمام مذاہب اپنی موجودہ صورت میں یکساں طور پر برحق ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے تمام مذاہب ایک تھے مگر بعد کو تبدیلی اور اضافہ کے

نتیجہ میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ "لوگ ایک امت تھے۔ انھوں نے اختلاف کیا تو اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے۔ اور ان کے ساتھ اتاری کتاب حق کے ساتھ تاکہ وہ فیصلہ کر دے ان باتوں کا جن میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ اور یہ اختلاف انھیں لوگوں نے کیا جن کو حق دیا گیا تھا، بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات آچکی تھیں، آپس کی ضد کی وجہ سے۔ پس اللہ نے اپنی توفیق سے حق کے معاملہ میں ایمان والوں کو راہ دکھائی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔" (البقرہ ۲۱۳)

قرآن کی اس آیت میں مذاہب کی جو نوعیت بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا نے انسانیت کا آغاز ایک پیغمبر سے کیا۔ اس کو اپنی تعلیمات دیں تاکہ وہ لوگوں کو ان سے آگاہ کر دے۔ مگر بعد کی نسلوں میں بگاڑ آیا اور خدا کی تعلیم اپنی اصل صورت میں باقی نہ رہی۔ اب دوسرا پیغمبر آیا جس نے خدا کی تعلیمات کو از سر نو اس کی صحیح صورت میں پیش کیا۔ مگر بعد کی نسلوں میں دوبارہ بگاڑ آگیا اور دوبارہ ایسا ہوا کہ خدا کی تعلیم اپنی اصل صورت میں باقی نہ رہی۔ اس کے بعد پھر نیا پیغمبر آیا تاکہ وہ از سر نو خدا کے دین کی تجدید کرے۔

یہ معاملہ ہزاروں سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ آخری زمانہ میں بگاڑ جب بہت بڑھ گیا تو پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد ﷺ خدا کی طرف سے بھیجے گئے۔ قرآن میں آیا ہے کہ —— "اور ہم نے تم پر کتاب صرف اس لئے اتاری ہے کہ تم ان کو وہ چیز کھول کر سنا دو جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں اور وہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں۔" (النحل ۱۶)

پیغمبر عربی ﷺ کے ذریعہ مذہبی اختلافات کو ختم کر کے مذہب کا جو مستند متن عطا کیا گیا وہ کتاب الٰہی کا آخری متن ہے۔ واضح ہو کہ نیا نبی صرف عملی بگاڑ پر نہیں آتا بلکہ وہ اس وقت آتا ہے جب کہ خدا کی کتاب میں بگاڑ آجائے اور خدا کی رہنمائی اپنی اصل صورت میں باقی نہ رہے۔

پیغمبر عربی ﷺ کے بعد ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب (قرآن) مکمل طور پر محفوظ ہو گئی۔ اس حفاظت کے بعد اب نئے پیغمبر کے آنے کا کوئی سوال نہیں۔

قوموں میں ہمیشہ عملی اور اخلاقی بگاڑ آتا ہے اور پیغمبر آخر الزماں کے بعد بھی ایسا بگاڑ آئے گا۔ مگر عملی بگاڑ کی حالت میں مصلح کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ پیغمبر کی۔ ایک حدیث رسول میں یہی بات اس طرح کہی گئی ہے کہ میرے بعد ہر سو سال پر ایک مجدد آتا رہے گا۔ مجددین اور مصلحین کے ظہور کا یہ عمل پچھلے چودہ سو سال سے جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ مگر اب قیامت تک کوئی نیا پیغمبر آنے والا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام تمام قوموں کا مذہب ہے۔ وہ دوسرے مذاہب ہی کا صحیح اور مستند ایڈیشن ہے۔ اسلام کو پانا خود اپنے مذہب کو پانا ہے۔ آج جو شخص اسلام کو اختیار کرے اس نے گویا خود اپنے گم شدہ مذہبی سرمایہ کو دوبارہ محفوظ صورت میں حاصل کر لیا۔

دینِ کائنات

میں نے انگریزی الرسالہ جاری کیا تو اس کے پہلے شمارہ (فروری ۱۹۸۴) کے صفحہ اول پر یہ الفاظ شائع کئے 'انسان اور کائنات دونوں کا مذہب صرف ایک ہے، اور وہ ہے خدا کی اطاعت':

Submission to God is the only religion
for both— Man and the Universe.

یہ عین قرآن کی بات ہے۔ اس کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: "کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے ۔ اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے"۔ (آل عمران ۸۳)

خدا کا دین صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات صرف ایک خدا کی کامل اطاعت کریں۔ وہ ہر معاملہ میں وہی کریں جو خدا کی مرضی ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیں۔ یہ دین اطاعت یا دین تابع داری انسان کے سوا بقیہ کائنات میں اس طرح نافذ ہے کہ کائنات کا ہر جزء خدا کے حکم کے تحت بندھا ہوا ہے۔ کائنات کا کوئی جزء ایک لمحہ کے لئے بھی اس حکم الٰہی سے انحراف نہیں کر سکتا۔ اسی کو سائنس کی زبان میں قانون فطرت (law of nature) کہا جاتا ہے۔

حکم الٰہی کی یہی اطاعت انسان سے بھی مطلوب ہے، اس فرق کے ساتھ کہ بقیہ کائنات مجبورانہ طور پر حکم خداوندی کی اطاعت کر رہی ہے۔ اور انسان کو اسی حکم کی اطاعت اختیارانہ طور پر کرنا ہے۔ یعنی بقیہ کائنات کو اپنے عمل کے معاملے میں انتخاب (choice) کا حق نہیں۔ جب کہ انسان کو اس دنیا میں انتخاب کی آزادی حاصل ہے۔ وہ چاہے تو اطاعت کا طریقہ اختیار کر کے خدا کے ابدی انعام کا مستحق بنے، یا خدا کے حکم سے انحراف کر کے ابدی طور پر اس کا برا انجام

بھگتے۔

خدا کے اس دین کا اعلان ہر دور میں اور تمام نبیوں کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ انجیل میں یہی بات حضرت مسیحؑ کی زبان سے ان الفاظ میں آئی ہے:

"پس تم اس طرح دعا کیا کرو کہ اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہت آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی پوری ہو"۔ (متی باب ٦)

اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں میں، بالفاظ دیگر، انسان کے سوا بقیہ کائنات جس طرح کسی انحراف کے بغیر خدا کے حکم پر چل رہی ہے، اسی طرح انسان بھی پوری طرح خدا کی مرضی پر چلنے لگے۔ حضرت مسیح کے قول میں بادشاہت (kingdom) کا لفظ کسی سیاسی معنی میں نہیں ہے۔ وہ صرف ایک اسلوب کلام ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر انسانی فرد اپنی زندگی میں خدا کے احکام پر چلنے لگے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کچھ افراد اپنے آپ کو خدا کا نمائندہ بتا کر یہ کہیں کہ لوگوں کے اوپر ہم اپنا اقتدار قائم کریں گے تاکہ ان کے درمیان خدا کے حکم کو بزور نافذ کر سکیں۔

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کون ہے اور کافر کون۔ مومن وہ ہے جو خدا پر کامل یقین رکھتے ہوئے اپنی زندگی کو خدا کے حوالے کر دے۔ حدیث کے الفاظ میں، وہ اس گھوڑے کی طرح ہو جائے جو ایک محدود لمبائی والی رسی کے ساتھ کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ وہ کھونٹے کے چاروں طرف گھومتا ہے مگر وہ رسی کی حد سے آگے نہیں جا سکتا۔ (مسند احمد ۵۵/۳)

اس کے مقابلہ میں کافر وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کی رسی میں نہ باندھے۔ وہ اپنی زندگی کو خدا کی مرضی کے تابع نہ بنائے۔ بلکہ وہ اپنی عقل اور اپنی خواہش کے پیچھے چلتا رہے۔ مومن یا کافر دونوں میں سے کسی کا بھی تعلق کسی نسل یا قوم سے نہیں ہے بلکہ دونوں ہی کا تعلق انفرادی عمل سے ہے۔ یہ دراصل ذاتی عمل ہے جو کسی کو خدا کی نظر میں مومن بناتا ہے۔ اور دوبارہ یہ ذاتی عمل

ہی ہے جو کسی کو خدا کی نظر میں کافر کا درجہ دے دیتا ہے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک شخص جو آج بظاہر مومن ہے وہ اپنی غیر مومنانہ فکر اور اپنی غیر مومنانہ روش سے خدا کی نظر میں کافر بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص جو آج بظاہر کافر ہے وہ اگر ایمان اور ایمان والی زندگی کو اختیار کر لے تو خدا کی نظر میں وہ مومن کا درجہ حاصل کر لے گا۔

اس معاملہ میں "دو قومی نظریہ" درست نہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ مومن اور کافر دو نسلی گروہ ہیں۔ ایک گروہ کے لئے قومی جنت ہے اور دوسرے گروہ کے لئے قومی جہنم۔ صحیح بات یہ ہے کہ ایمان اور کفر یا جنت اور جہنم کا معاملہ تمام تر افراد کے ذاتی عقیدہ و عمل سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ نسل اور قوم کی اجتماعی نسبت سے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا ایک ہی دین ہے جو اس کی تمام مخلوقات سے یکساں طور پر مطلوب ہے۔ انسان کے سوا بقیہ کائنات میں وہ لازمی ڈسپلن کی صورت میں قائم ہے، اور انسان کی زندگی میں وہ اختیاری ڈسپلن کی صورت میں قائم ہوتا ہے۔ بقیہ کائنات کی دنیا میں اس کا نام قانون فطرت ہے، اور انسان کی دنیا میں اس کا نام قانون شریعت۔

چند مثالیں

قرآن کی سورۃ نمبر ۱۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اللہ ہی ہے جس نے آسمان کو بلند کیا بغیر ایسے ستون کے جو تمہیں نظر آئیں۔ پھر وہ اپنے تخت پر متمکن ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو ایک قانون کا پابند بنایا۔ ہر ایک، ایک مقرر وقت پر چلتا ہے۔ اللہ ہی ہر امر کی تدبیر کرتا ہے۔ اور وہی آیات کی تفصیل کر رہا ہے تا کہ تم اپنے رب سے ملنے کا یقین کرو۔ (الرعد ۲)

قرآن کے اس بیان میں تدبیر امر سے مراد خدا کا وہ انتظام ہے جو وہ کائنات میں براہ راست اور کامل طور پر نافذ کئے ہوئے ہے۔ اور تفصیل آیات سے مراد وہ آیات ہیں جو وحی کے ذریعہ پیغمبر پر نازل کی گئی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اول الذکر سے مراد قانون فطرت ہے

اور ثانی الذکر سے مراد قانون شریعت۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ دونوں ایک ہیں۔ ان میں صرف یہ فرق ہے کہ ایک مجبورانہ طور پر مطلوب ہے اور دوسرا اختیارانہ طور پر۔

انسان کو عین وہی دین خود اپنی مرضی سے اختیار کرنا ہے جس کو بقیہ کائنات خارجی حکم کے تحت اختیار کئے ہوئے ہے۔ مثلاً قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کی تسبیح بیان کرتی ہیں (الجمعہ ۱)۔ کائنات کی یہ چیزیں زبان حال سے اس طرح تسبیح کر رہی ہیں کہ ان کا وجود مکمل طور پر خدا کی قدرت و عظمت کا عملی اظہار بن گیا ہے۔ انسان کو یہی تسبیح شعوری طور پر زبان قال سے کرنا ہے۔ یعنی اس کا سینہ خدا کی عظمتوں کے احساس سے اس طرح سرشار ہو جائے کہ وہ اسی کے ترانے گانے لگے۔

اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ درخت اور دوسری بلند چیزیں اللہ کے آگے سجدہ کرتی ہیں۔ یہ سجدہ سائے کی صورت میں ہوتا ہے (الرعد ۱۵) زمین پر کھڑی ہوئی چیزوں کے اوپر جب سورج کی روشنی پڑتی ہے تو مخالف سمت میں ان کا سایہ نیچے زمین پر پڑ جاتا ہے۔ یہ گویا مادّی چیزوں کا سجدہ ہے۔ یہی سجدہ انسان سے اس طرح مطلوب ہے کہ اس کے دل میں خدا کی خدائی کے اعتراف کا طوفان برپا ہو اور وہ عبودیت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اللہ کا پرستار بن جائے۔ وہ اس کے آگے بے تابانہ طور پر سجدہ میں گر پڑے۔

اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے درخت پیدا کیا جو انسان کو طرح طرح کے فائدے یک طرفہ طور پر دیتا ہے (ابراہیم ۲۴)۔ انسان کو بھی اسی طرح دوسروں کے لئے نفع بخش بننا چاہئے۔ ہر انسان کو شعوری طور پر یہ کوشش کرنا چاہئے کہ اس کی ذات سے دوسروں کو سایہ اور پھل اور خوشبو اور سرسبزی ملے۔ وہ دنیا والوں کے لئے فرحت بخش باغ بنے نہ کہ خشک صحرا۔ اور یہ سب کچھ وہ یک طرفہ طور پر خدا کے لئے کرے نہ کہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے۔

اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے لوہا پیدا کیا جس میں زبردست طاقت ہے (الحدید ۲۵)۔ مادی دنیا میں لوہا ایک پر اعتماد دھات کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان سے بھی یہی اعتماد والی صفت

مطلوب ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ حدیدی کردار کا حامل بنا ہوا ہو۔ وہ کبھی اپنے قول سے نہ پھرے۔ وہ کبھی اپنے عمل میں کمزوری نہ دکھائے۔ وہ ایک پختہ سیرت والا آدمی ہو۔ وہ لوہے کی طرح قابل پیشین گوئی کردار (predictable character) کا مالک بن جائے۔

اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ "اللہ نے آسمان کو بلند کیا اور اس میں ترازو رکھ دی کہ تم تولنے میں زیادتی نہ کرو۔ (الرحمٰن ۷۔۸) اللہ تعالیٰ نے زمین میں نہایت متناسب کشش رکھی ہے۔ اسی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ ترازو بالکل درست تولتا ہے۔ اس طرح اللہ نے دنیا میں انصاف کا ایک علامتی نمونہ قائم کردیا ہے۔ اب انسان کو یہ کرنا ہے کہ دوسروں سے معاملہ کرنے میں وہ کبھی غیر منصفانہ روش اختیار نہ کرے۔ ایک درست ترازو کی طرح وہ ایسا کرے کہ جب اس کو دوسروں سے لینا ہو تو ٹھیک اتنا ہی لے جتنا کہ اس کا حق ہے۔ اسی طرح جب دوسروں کو دینا ہو تو وہ ان کا پورا حق ادا کرے۔ وہ لین دین میں غیر منصفانہ قسم کی ہر کمی اور زیادتی سے اپنے آپ کو بچائے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آسمان میں تمام اجرام گھوم رہے ہیں۔ "نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔ اور سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔ (یٰس ۴۰) خلا میں ان گنت ستارے اور سیارے ہیں۔ یہ سب کے سب نہایت تیزی کے ساتھ گھوم رہے ہیں۔ مگر ان کے درمیان کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ستارہ یا سیارہ حد درجہ پابندی کے ساتھ اپنے مدار (orbit) میں گھومتا ہے۔ وہ کبھی اپنے مقرر مدار سے نہیں ہٹتا۔

ٹھیک یہی روش انسان سے بھی مطلوب ہے۔ ہر انسانی فرد اور ہر انسانی گروہ کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو اس طرح جاری کرے کہ اس کا ٹکراؤ ایک دوسرے سے نہ پیش آئے۔ کوئی بھی شخص یا قوم یہ نہ کرے کہ وہ اپنا فائدہ لینے کے لئے دوسرے کو نقصان پہونچانے لگے۔ خلا کے تمام متحرک اجرام دوسروں کے لئے مسئلہ بنے بغیر اپنا عمل جاری کئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے مقصد کو اس طرح حاصل کرے کہ اس نے دوسروں کے لئے

کوئی مسئلہ کھڑا نہ کیا ہو۔

خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اپنی جو کتابیں نازل فرمائیں ان کا مقصد اسی قانون فطرت کا شرعی اظہار تھا۔ مگر اب کوئی سابق کتاب اپنی اصل صورت میں محفوظ نہیں رہی۔ اب صرف قرآن خدا کی واحد محفوظ کتاب ہے۔ اس بنا پر اب صرف قرآن تنہا مستند ذریعہ ہے جس سے کوئی شخص صحیح طور پر یہ جان سکتا ہے کہ دنیا میں وہ کس طرح زندگی گزارے، جس کے بعد آخرت میں وہ خدا کا محبوب بندہ ٹھہرے۔ اس کو دنیا میں بھی خدا کی رحمتیں ملیں اور آخرت میں بھی۔

قرآن کی سورہ نمبر ۳۳ میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔ تاکہ خدا منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں پر رحمت فرمائے۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے (الاحزاب ۷۲۔ ۷۳)

اس آیت میں خدا کا وہ منصوبہ بتایا گیا ہے جس کے تحت اس نے موجودہ کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اس منصوبہ کے مطابق بقیہ کائنات اس بات کی پابند ہے کہ وہ خدا کے حکم سے کسی بھی قسم کا کوئی انحراف نہ کرے۔ وہ آخری حد تک اطاعت شعارانہ انداز میں خدا کے تخلیقی نقشہ کی تعمیل کرتی رہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان کو انتخاب (choice) کی آزادی ملی ہوئی ہے۔ انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اپنے آپ کو خدا کے تخلیقی نقشہ کا پابند بنائے اور چاہے تو اس کے خلاف عمل کرے۔

موجودہ دنیا میں انسان کا اصل امتحان یہی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے ملے ہوئے اختیار کا غلط استعمال نہ کرے۔ وہ اپنی سوچ کو خدائی نقشہ کا تابع بنائے۔ وہ اپنی کارروائیوں میں کبھی جائز حد سے باہر نہ جائے۔ وہ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہمیشہ خدائی انصاف کا پابند بنا رہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ خدا کی دنیا میں خدا کا بندہ بن کر رہے۔ وہ دوسروں کے اوپر خدا بننے کی کوشش نہ

کرے۔

آیت سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عملی ریکارڈ کے مطابق، خدا کی عدالت میں انسانوں کے دو مختلف گروہ قرار دئے جائیں گے۔ ایک وہ گروہ جس نے اپنے آپ کو خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق بنایا۔ جس نے وہی کیا جو خدا کی مرضی کے مطابق تھا اور وہ نہیں کیا جو خدا کی مرضی کے خلاف تھا۔ یہ لوگ خدا کے پسندیدہ بندے قرار پائیں گے۔ وہ خدا کی پر راحت جنتوں میں بسائے جائیں گے جہاں وہ ابدی طور پر خوشیوں کی زندگی گزارتے رہیں گے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کے تخلیقی نقشہ کے تابع نہ بنائے۔ خواہ وہ کھلم کھلا خدا کے تخلیقی نقشہ کو ماننے سے انکار کرے یا وہ منافقت کی زندگی اختیار کرے۔ یعنی بظاہر وہ خدا پرستوں کے ساتھ ملا ہوا ہو مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس کا دین خود پرستی ہو نہ کہ خدا پرستی۔ یہ دونوں ہی گروہ ظاہری اختلاف کے باوجود ایک ہی انجام کے مستحق قرار پائیں گے۔ دونوں کو یکساں طور پر جہنم میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ ابدی طور پر اپنی سرکشی کی سزا بھگتتے رہیں۔

توحید۔ انسانیت کی منزل

توحید کا مطلب ایک خدا کو ماننا ہے اور اپنے سارے دل اور اپنے سارے دماغ کے ساتھ اس سے وابستہ ہو جانا ہے۔ یہی خدا انسانیت کی منزل ہے۔ اس دنیا میں وہی انسان کامیاب ہے جو ایک خدا کو اپنا سب کچھ بنالے۔ ہر انسان ایک نامکمل وجود ہے۔ خدا کے ساتھ وابستہ ہو کر وہ اپنے آپ کو مکمل کرتا ہے۔ خدا انسانیت کے تمام تقاضوں کی واحد تکمیل ہے۔

ہر انسان ایک روحانی تلاش میں ہے۔ ہر انسان اپنے لئے سکون واعتماد کا ایک مرکز چاہتا ہے۔ یہ مرکز صرف ایک خدا ہے۔ خدا انسان کی روحانی تلاش کا واحد جواب ہے۔ جس انسان نے خدا کو پالیا، اس نے گویا وہ سب کچھ پالیا جس کو وہ اپنے فطری تقاضے کے تحت پانا چاہتا تھا۔

موجودہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے انسان کو ایک دستور حیات درکار ہے جو اس کو بتائے کہ لوگوں کے درمیان اس کو کس طرح رہنا ہے اور کس طرح نہیں رہنا ہے۔ جو اس کو زندگی کی گائڈ بک عطا کرے۔ انسان کی اس طلب کا ماخذ بھی خدا ہے۔ خدا ہی انسان کو وہ قابل اعتماد رہنمائی دیتا ہے جس کی مدد سے وہ روشنی اور اندھیرے میں یکساں طور پر درست سفر کر سکے۔

خدا انسان کا خالق اور مالک ہے۔ وہی اس کا حق دار ہے کہ وہ انسان کو بتائے کہ زندگی کیا ہے اور موت کیا ہے۔ انسانیت کا قافلہ کہاں سے شروع ہوا اور وہ کہاں جارہا ہے۔ وہ صحیح راستہ کیا ہے جس پر چل کر وہ بھٹکے بغیر منزل پر پہنچ سکے۔

ہر انسان کی سب سے پہلی اور سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ وہ اس خدا کو پائے، وہ اپنے آپ کو خدا سے وابستہ کرے، وہ اس سے محبت کا تعلق قائم کرے۔ وہ اپنی پوری زندگی کا رخ خدا کی طرف موڑ دے۔ خدارخی زندگی (God oriented life) ہی اس دنیا کی واحد درست زندگی ہے۔ جو ایسی زندگی کو اپنائے وہی کامیاب ہے اور جو ایسا نہ کر سکے وہی محروم اور ناکامیاب۔

توحید اور شرک

قرآن خدا کی کتاب ہے۔ قرآن خدا کی مرضی کا مستند اعلان ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ انسان کے لئے کون سا راستہ فلاح کا راستہ ہے اور کون سا راستہ خسران کا راستہ۔ انسانی زندگی کے دستور کے لئے قرآن ہی واحد مستند ماخذ ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان حالت امتحان میں ہے۔ یہ امتحان کس چیز میں ہے اسی کو بتانے کے لئے خدا نے قرآن اتارا۔

قرآن کے مطابق، شرک کا عقیدہ تمام انسانی برائیوں کی جڑ ہے۔ اس کے مقابلہ میں توحید کا عقیدہ تمام انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ قرآن میں واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ۔۔۔ بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کو جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جس نے کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرایا اس نے بڑا طوفان باندھا۔ (النساء۔۴۸)

توحید کی حقیقت

توحید کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے۔ یہ یقین کیا جائے کہ تمام طاقتیں اور ہر قسم کے اختیارات صرف ایک خدا کو حاصل ہیں۔ وہی تنہا عبادت کا مستحق ہے۔ عبادت کی قسم کا کوئی بھی فعل خدا کے سوا کسی اور کے لئے جائز نہیں۔ خدا ہی انسان کی مرادیں اور حاجتیں پوری کرتا ہے۔ خدا ہی کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ برتری صرف ایک خدا کا حق ہے، کسی اور کو اس دنیا میں حقیقی برتری حاصل نہیں۔ ایسا ہر عقیدہ باطل ہے جس میں ان تمام پہلوؤں میں خدا کے سوا کسی اور کو شریک کیا جائے۔

قرآن میں توحید کے عقیدہ کو ایک آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔۔۔ اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے، سب کا تھامنے والا۔ اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش

کرے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جو وہ چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ تھکتا نہیں ان کے تھامنے سے اور وہی ہے بلند مرتبہ والا اور بڑا (آل عمران۔ ۲۵۵)

خدا کی پرستش کرنا اپنے خالق و مالک کی پرستش کرنا ہے جو واقعی طور پر انسان کی پرستش کا حق دار ہے۔ اس کے برعکس کوئی آدمی جب غیر خدا کے آگے سر جھکاتا ہے تو وہ اپنے جیسی ایک مخلوق کے آگے سر جھکاتا ہے جو اس کا حقدار نہیں کہ اس کے آگے سر جھکایا جائے۔ خدا کی پرستش انسان کو عظمت عطا کرتی ہے اور غیر خدا کی پرستش اس کو پستی میں گرادیتی ہے۔ خدا کی پرستش انسان کو حقیقت پسند بناتی ہے اور غیر خدا کی پرستش اس کو توہمات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ خدا کی پرستش سے معرفت حق کے دروازے کھلتے ہیں اس کے برعکس آدمی جب غیر خدا کی پرستش کرتا ہے تو وہ حق کی معرفت کے دروازوں کو اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔

توحید صرف ایک ہے، مگر شرک کی ہزاروں قسمیں ہیں۔ موحد انسان کا مرکزِ توجہ اور مرکزِ عبودیت صرف ایک خدا ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں اور اپنی پوری زندگی میں اسی ایک خدا کو اپنا سب کچھ بنائے ہوئے رہتا ہے۔ مگر مشرک انسان کا کوئی ایک مرکزی نقطہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ شرک کی بے شمار قسمیں بن جاتی ہیں۔۔۔ ستارہ پرستی، زمین پرستی، بت پرستی، ارباب پرستی، قبر پرستی سے لے کر نفس پرستی، دولت پرستی، اقتدار پرستی، مفاد پرستی، اولاد پرستی وغیرہ یہ تمام چیزیں درجہ بدرجہ غیر اللہ کی پرستش میں شامل ہیں۔ اور قرآن میں ان کی کھلی مذمت کی گئی ہے۔ موحد انسان وہ ہے جو ہر قسم کی برتر حیثیت صرف ایک خدا کو دے۔ اسی سے اپنی مراد مانگے۔ اسی کے سامنے مراسم پرستش بجالائے، اسی پر سب سے زیادہ بھروسہ کرے، اسی کو ہر اعتبار سے برتر حیثیت دے۔ پرستش کسی سے تعلق کے اظہار کا آخری درجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرستش کی تمام صورتیں صرف ایک خدا کا حق ہیں۔ پرستش کی نوعیت کی کوئی چیز کسی غیر

خدا کے لئے جائز نہیں۔

آدمی جب خدا کو اپنا معبود بناتا ہے تو وہ ایک ایسی ہستی کو اپنا معبود بناتا ہے جو حقیقی طور پر موجود ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی آدمی غیر خدا کو اپنا معبود بنائے تو اس نے ایک ایسی چیز کو اپنا معبود بنایا جس کا واقعات کی دنیا میں سرے سے کوئی وجود ہی نہیں، خواہ بظاہر اس نے اس مفروضہ معبود کی ایک صورت بنا کر اپنے سامنے رکھ لی ہو۔ جو آدمی خدا کو اپنا معبود بنائے اس نے طاقت کے حقیقی سرچشمہ کو پالیا۔ اس کے برعکس جو آدمی غیر خدا کو اپنا معبود بناتا ہے وہ ایک ایسے توہماتی مفروضہ سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے جس کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔ خدا کا عبادت گزار ابدی سعادت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غیر خدا کے عبادت گزار کے لئے ابدی محرومی کے سوا کوئی اور چیز نہیں۔

خدا کائنات کا نور

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (النور ۳۵) یعنی اس پوری کائنات میں جہاں بھی کوئی روشنی ہے وہ خدا کی ذات سے ہے۔ خدا اگر روشنی نہ دے تو کہیں اور سے کسی کو بھی روشنی ملنے والی نہیں۔

سورج اگر نہ ہو تو زمین پر ہر طرف اندھیرا چھا جائے۔ اسی طرح اگر ستارے نہ ہوں تو ساری کائنات گہری تاریکی میں ڈوب جائے۔ خدا نے ساری کائنات میں بے شمار تعداد میں انتہائی روشن قسم کے متحرک اجسام پھیلا دئے ہیں جو کائنات کے ہر حصہ کو مسلسل طور پر روشنی کا تحفہ دے رہے ہیں۔ اگر یہ کائناتی انتظام نہ ہو تو دنیا اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تاریکی کا ایک بھیانک غار بن جائے گی۔

یہ مادی روشنی کا معاملہ ہے۔ یہی معاملہ فکری اور روحانی روشنی کا ہے۔ اس دنیا میں بسنے والے ہر انسان کو ضرورت ہے کہ اس کے ذہن کو وہ رہنمائی ملے جس کی روشنی میں وہ صحیح طور پر

سوچے اور اس کو وہ روحانی خوراک ملے جو اس کے سینہ میں حکمت حیات کا باغ اگا دے۔ اس فکری اور روحانی روشنی کا سرچشمہ بھی صرف اور صرف خداوند ذوالجلال ہے۔ یہ روحانی روشنی بھی ایک خدا کے سوا کہیں اور سے انسان کو ملنے والی نہیں۔

آدمی جب خدائے واحد پر سچا یقین کرتا ہے تو نفسیاتی سطح پر خدا سے اس کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد روحانی تاروں پر اس کی پوری ہستی جگمگا اٹھتی ہے۔ وہ اپنی یادوں میں خدا کو پانے لگتا ہے۔ وہ اپنے آنسوؤں میں خدا کی جھلک دیکھنے لگتا ہے۔ اس کی سوچ اور جذبات میں خدا اس طرح بس جاتا ہے جیسے کہ وہ خدا کے پڑوس میں پہنچ گیا ہو، جیسے کہ وہ خدا کے رحمت بھرے سایہ میں زندگی گزارنے لگا ہو۔

قرآن میں شرک کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے (لقمان ۱۳) ظلم کا مطلب ہے کسی چیز کو غیر جگہ پر رکھ دینا (وضع الشی فی غیر موضعہ) یعنی شرک (خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنا) اس کائنات میں سراسر اجنبی ہے۔ اس دنیا میں شرک کا عقیدہ رکھنے یا مشرکانہ فعل کرنے کے لئے کائنات میں کوئی جگہ نہیں۔

اس دنیا کا خالق ایک ہی خدا ہے۔ وہی اس کا مالک ہے۔ وہی اس کو سنبھالنے والا ہے۔ اسی کے پاس ہر قسم کے اختیارات ہیں۔ ایسی حالت میں جو شخص خدا کے سوا کسی اور کو خدا ماننے یا کسی اور کو خدا کی خدائی میں شریک کرے اس نے ایک خود ساختہ مفروضہ کو واقعی حقیقت کا درجہ دیا۔ اس نے ایک ایسی چیز کو موجود فرض کیا جس کا اس دنیا میں سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔

مشرکانہ طرز فکر تمام برائیوں میں سب سے بڑی برائی ہے۔ جس آدمی کا ذہن مشرکانہ طرز پر سوچے، جس آدمی کے دل میں مشرکانہ خیالات پرورش پائیں، وہ ایک بے حقیقت چیز کو اختیار کرتا ہے۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کی تردید کرتی ہے۔

شرک کا عقیدہ یا نظریہ آدمی کو فکری غذا دینے والا نہیں۔ وہ اس کو اس روحانی روشنی

سے منور کرنے والا نہیں جس کے بغیر آدمی کا پورا وجود ہی اس دنیا میں بے معنی ہو جاتا ہے۔

توحید اور شرک کا فرق

توحید کا مطلب خالق کو پالینا ہے اور شرک کا مطلب یہ ہے کہ آدمی مخلوقات میں اٹک کر رہ جائے۔ توحید حقیقت کی سطح پر جینے کا نام ہے اور شرک کا مطلب توہمات کی سطح پر جینے کا نام۔ توحید اپنی فطرت کی دریافت کا نتیجہ ہے اور شرک اپنی فطرت سے بے خبری کا نتیجہ۔ اہل توحید ہی اس دنیا کے مطلوب انسان کی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ یہی لوگ ہیں جو خالق کی منشا کے مطابق ہیں۔

دنیا کے بنانے والے نے اس کو جس منصوبے کے تحت بنایا ہے اہل توحید اس منصوبہ الٰہی کی تکمیل کر رہے ہیں۔ وہ اسی نقشہ پر ہیں جس نقشہ پر انسان کو ہونا چاہئے۔ اہل توحید خدا کے مطلوب انسان ہیں۔ وہ دنیا میں دنیا کے مالک کی مرضی کو پورا کر رہے ہیں۔

شرک اور اہل شرک کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ شرک خدا کی دنیا میں ایک اجنبی تصور ہے۔ اہل توحید اگر اس دنیا میں مطلوب لوگ (wanted people) ہیں تو اہل شرک اس کے برعکس غیر مطلوب لوگ (unwanted people)۔ شرک کے عقیدہ کو اس دنیا میں اس کے مالک کی سند حاصل نہیں۔ شرک کی روش اس دنیا میں ایک ایسی روش ہے جس کی اجازت دنیا کے مالک نے دنیا میں بسنے والوں کو نہیں دی۔

گول خانہ میں کوئی چوکور چیز رکھی جائے تو وہ اس کے اندر فٹ نہیں بیٹھے گی۔ جب کہ گول خانہ میں گول چیز بالکل فٹ بیٹھ جاتی ہے۔ یہی معاملہ توحید اور شرک کا ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے صرف توحید کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے توحید کا تصور یا موحدانہ زندگی اس کی فطرت کے عین مطابق ہے جب کہ شرک کا عقیدہ یا مشرکانہ زندگی انسانی فطرت کے مطابق نہیں۔

مشرک انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ غیر خدائی چیزیں اس کی توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس لئے پیش آنے والے مختلف حالات میں اس کا رویہ بھی انھیں غیر خدائی ہستیوں کی نسبت سے متعین ہوتا ہے۔ وہ اپنی کامیابی میں بھی انھیں کی طرف دوڑتا ہے اور ناکامی میں بھی وہ انھیں کی پناہ تلاش کرنا چاہتا ہے۔

اس کی مفروضہ غیر خدائی ہستیاں ہی ہر صورت حال میں اس کے دل ودماغ پر چھائی رہتی ہیں۔ موحد انسان اگر اپنے تجربات سے توحید کی غذا پاتا رہتا ہے تو مشرک انسان کے لئے اس کے تجربات مشرکانہ غذا کے حصول کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

آدمی ہر لمحہ کچھ حالات کے درمیان جیتا ہے ـــــ خوشی کے حالات یا غم کے حالات، تکلیف کے حالات یا آرام کے حالات، کامیابی کے حالات یا ناکامی کے حالات، اختیار واقتدار کے حالات یا بے اختیاری کے حالات، غلبہ کے حالات یا مغلوبیت کے حالات، موافق حالات یا غیر موافق حالات۔ ان مختلف حالات میں ایک رویہ (response) موحدانہ رویہ ہے اور دوسرا رویہ مشرکانہ رویہ۔

موحد انسان خدا کی عظمت میں جی رہا ہوتا ہے اس لئے اس کی زندگی میں پیش آنے والا ہر واقعہ اس کو خدا کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ اس کا رویہ ہر موقع پر وہی ہوتا ہے جو اس کے عقیدۂ توحید کے مطابق ہو۔ وہ ہر صورت حال میں ایک سچا خدا پرست انسان ثابت ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے اتار چڑھاؤ میں اپنے اعتدال کو نہیں کھوتا۔ وہ خواہ جس حال میں ہو، ہمیشہ اپنے خدا سے وابستہ رہتا ہے۔ خدا اس کی تمام توجہات کا مرکز بن جاتا ہے، وہ کسی بھی حال میں اس سے نہیں ہٹتا۔

توحید خدا کی نظر میں سب سے زیادہ با قیمت چیز ہے اور شرک خدا کی نظر میں سب سے زیادہ بے قیمت چیز۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاملہ کا تعلق اس انتہائی مخصوص چیز سے ہے جو انسان کا سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ ہے۔ اور وہ ہے کسی سے گہرا قلبی تعلق۔ یہ انسان کی سب سے

زیادہ اعلیٰ متاع ہے۔اسی گہرے قلبی تعلق کا صرف ایک خدا سے وابستہ ہو جانے کا نام توحید ہے۔ اگر یہ گہری وابستگی خدا کے سوا کسی اور سے ہو تو اسی کا نام شرک ہے۔

اس گہرے قلبی تعلق کا اظہار دو قسم کے جذبات کی صورت میں ہوتا ہے۔ایک محبت، اور دوسرے خوف۔ قرآن میں موحد انسان کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کو سب سے زیادہ محبت صرف ایک خدا سے ہوتی ہے (البقرہ ۱٦۵) اور سب سے زیادہ خوف بھی صرف ایک خدا سے (التوبہ ۱۸)

یہ حب شدید اور خوف شدید صرف اس ہستی کا حق ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے، جو اس کا مالک اور رب ہے۔جو آدمی یہ مخصوص تعلق کسی اور سے قائم کرے تو اس نے شرک کیا۔ اس نے وہ چیز کسی اور کو دے دی جو صرف ایک خدا کا حصہ تھی۔

آدمی کو جس چیز سے یہ گہرا قلبی تعلق ہو جائے وہ ہر لمحہ اس کے بارہ میں سوچتا ہے۔ اس کے جذبات میں وہی ہر وقت سمایا ہوا ہوتا ہے۔وہ اسی کو پانے سے خوش ہوتا ہے، اس سے محرومی کا اندیشہ اس کو تڑپا دیتا ہے۔اس کے دل میں شوق کا طوفان اٹھتا ہے تو اسی کے لئے اٹھتا ہے۔اس کو چھننے کا خوف ہوتا ہے تو اسی سے۔وہ پانے کی امید رکھتا ہے تو اسی سے۔اس کی آنکھیں روتی ہیں تو اسی کو یاد کر کے روتی ہیں۔اس کی سوچ پر غلبہ رہتا ہے تو صرف اسی ایک کا غلبہ رہتا ہے۔اس کا وجود کسی کے آگے ڈھ پڑتا ہے تو وہ صرف یہی ایک اعلیٰ اور برتر ذات ہوتی ہے۔

اسی لطیف انسانی جذبہ کو عبودیت کہا جاتا ہے۔ اس جذبۂ عبودیت میں خدا کسی کی شرکت کو گوارا نہیں کرتا۔اس جذبۂ عبودیت کا مستحق صرف ایک خدائے عظیم ہے، اس کے سوا کوئی نہیں جو ادنیٰ درجہ میں بھی اس کا مستحق ہو۔

پیغمبروں کا مشن

پچھلے زمانوں میں خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے وہ سب اسی لئے آئے کہ وہ انسان کو

شرک سے ڈرائیں اور انھیں توحید کی تعلیم دیں، تاکہ انسان اس کے مطابق، اپنی زندگی کی اصلاح کرے اور دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کر سکے۔ مگر انسانیت کی لمبی تاریخ میں تقریباً ہر پیغمبر کے ساتھ ایسا ہوا کہ لوگوں کی زیادہ تعداد نے ان کی بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ خاص طور پر سماج کے بڑے لوگ کبھی پیغمبر کو ماننے یا ان کا ساتھ دینے پر راضی نہیں ہوئے۔ اس تاریخی واقعہ کو قرآن مین اس طرح بتایا گیا ہے۔۔۔افسوس ہے بندوں کے اوپر، جو رسول بھی ان کے پاس آیا وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے رہے (یٰسین: ۳۰)

خدا کے پیغمبروں کو نظر انداز کرنے کا یہ معاملہ اس حد تک بڑھا کہ پچھلے دور میں آنے والے پیغمبروں کو انسانی تاریخ کے ریکارڈ سے حذف کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ماضی کی مدون تاریخ میں بادشاہوں کی داستانیں تو پڑھتے ہیں مگر پیغمبروں کا تذکرہ مدون تاریخ میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس معاملہ میں صرف پیغمبر اسلام ﷺ کا واحد استثنا ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد حاصل ہوئی۔ چنانچہ آپ نے پہلی بار ردّ شرک اور اثبات توحید کی تحریک کو ایک ایسی زندہ تحریک بنا یا جس نے اس تحریک کو فکری مرحلہ سے اٹھا کر عملی انقلاب کے مرحلہ تک پہنچا دیا اور اس کی ایک مستقل تاریخ بنا دی۔

ردّ شرک اور اثبات توحید کی یہ تحریک قدیم زمانہ میں کیوں عملی انقلاب کے درجہ تک نہ پہنچ سکی۔ اس کا سبب خاص طور پر دو تھا۔ ایک بادشاہت کا نظام، دوسرے، توہماتی افکار کا غلبہ۔ یہی دو بنیادی اسباب تھے جو پیغمبروں کے مشن کے خلاف ایک مستقل رکاوٹ بنے رہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ سے پہلے کے دور میں مشرکانہ بادشاہت کا نظام قائم تھا۔ موجودہ زمانہ میں جمہوری سیاست کا اصول رائج ہے۔ سیاسی لیڈر عوامی ووٹوں کے ذریعہ اپنے لئے حکمرانی کا حق حاصل کرتے ہیں۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ اس کے برعکس یہ کرتے تھے کہ وہ لوگوں کو یہ یقین دلا کر حکومت کرتے تھے کہ ہم خدا کے نمائندے ہیں۔ ہم خدا کی اولاد ہیں۔ اسی نظریہ کے تحت

قدیم زمانہ میں سورج ونشی اور چندر ونشی کا عقیدہ پیدا ہوا۔ گویا موجودہ زمانہ میں حکومت کی بنیاد سیکولر جمہوریت ہے جب کہ قدیم زمانہ میں حکومت کی بنیاد مشرکانہ عقیدہ پر ہوتی تھی۔ اسی واقعہ کی طرف قرآن میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: انا ربکم الاعلیٰ (النازعات ۲٤) اس بنا پر یہ بادشاہوں کے عین سیاسی مفاد میں تھا کہ شرک کا عقیدہ دنیا میں قائم رہے۔

چنانچہ ان کی خصوصی سرپرستی کے تحت عبادت گاہ سے لے کر جینے مرنے کی رسموں تک زندگی کا پورا نظام شرک کے اوپر قائم ہو گیا تھا۔

یہ مشرکانہ نظام قدیم زمانہ میں ہزاروں سال تک تمام دنیا میں چھایا رہا۔ بادشاہوں کی سرپرستی کی بنا پر یہ مشرکانہ نظام اتنا زیادہ طاقتور ہو گیا کہ وہ ہمیشہ پیغمبروں کے خلاف ایک موثر رکاوٹ بنا رہا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کی تحریک صرف پیغام رسانی کے مرحلہ تک محدود رہی، وہ وسیع تر عملی انقلاب کے مرحلہ تک نہ پہنچ سکی۔

اس سلسلہ میں دوسری رکاوٹ وہ تھی جس کو توہماتی افکار کا دور کہا جا سکتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جب کہ جدید قسم کی سائنسی دریافتیں نہیں ہوئی تھیں، انسان فطرت کے مظاہر کی صحیح نوعیت کو نہیں سمجھ پایا تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ دنیا میں مختلف قسم کی حیران کن چیزیں ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ اور سمندر، زمین اور آسمان، درخت اور حیوانات وغیرہ وغیرہ۔ مظاہر کے اس تعدد کو دیکھ کر انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ ان کے خالق بھی کئی ہیں یا یہ کہ مختلف مظاہر خود مختلف خداؤں کا ظہور ہیں۔ اس طرح تعدد مظاہر کی بنا پر تعدد الٰہ کا نظریہ پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ سورج اور چاند کو ان کے غیر معمولی پن کی بنا پر خدا یا دیوتا سمجھا جانے لگا۔ انسان کے لئے یہ ناقابل یقین ہو گیا کہ جب مخلوقات میں اتنا زیادہ تنوع اور تعدد ہے تو ان سب کا خدا ایک کیسے ہو سکتا ہے۔

اسی حقیقت کی طرف خدا کے پیغمبر حضرت ابراہیمؑ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا: رب انھن اضللن کثیراً (ابراھیم ۳٦) یعنی فطرت کے یہ نمایاں مظاہر (سورج، چاند وغیرہ) نے

انسان کو دھوکہ میں ڈال دیا۔ لوگ انہیں مظاہر کو عظیم سمجھنے لگے۔ حالانکہ انھیں چاہیے تھا کہ وہ ان تمام چیزوں کو عظیم خدا کی مخلوق سمجھیں۔ مگر اس کے برعکس انھوں نے خود مخلوقات ہی کو خدا سمجھ کر ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ موجودہ زمانہ میں مذکورہ دونوں افسانوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ایک طرف جمہوری افکار کے ذریعہ ساری دنیا میں جو طاقتور سیاسی انقلاب آیا اس نے قدیم طرز کی مشرکانہ بادشاہت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ اب آج کی دنیا میں قدیم طرز کے بادشاہوں کا کہیں وجود نہیں۔ وہ جدید جمہوریت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ اس جدید سیاسی انقلاب کے بعد مشرکانہ عقیدہ یا مشرکانہ نظام اس موثر سرپرستی سے محروم ہو گیا جو ردّ شرک اور اثبات توحید کی دعوت میں طاقتور رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اب یہ امکان پوری طرح کھل گیا ہے کہ پیغمبرانہ دعوت کو بھرپور طور پر جاری کیا جائے اور اس کو اس طرح چلایا جائے کہ اول سے آخر تک کسی بھی مرحلہ میں اس کو کسی مزاحمت کا خطرہ نہ ہو۔

سائنس کے دور میں

اسی طرح جدید سائنس کے ظہور نے شرک کی دوسری بنیاد کو بھی ختم کر دیا۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی دریافتوں کے ذریعہ یہ افسانہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا کہ فطرت کے مظاہر میں کوئی حقیقی تعدد ہے یا انھیں کوئی ذاتی عظمت حاصل ہے۔

جدید سائنس نے ایک طرف یہ کیا کہ اپنے تجزیہ اور تجربہ کے ذریعہ آخری طور پر یہ ثابت کر دیا کہ تمام چیزیں، ظاہری تعدد کے باوجود، اپنے آخری تجزیہ میں صرف ایٹم کا مجموعہ ہیں۔ اور ایٹم برقیاتی لہروں کا مجموعہ ہے۔ اس دریافت کے بعد فطرت میں تعدد کا افسانہ ختم ہو گیا۔ تمام چیزیں ظاہری فرق کے باوجود، اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ثابت ہو گئیں۔ گویا علم کی اگلی ترقی نے مشرکانہ نظریہ کو رد کر کے توحید کے نظریہ کے لئے ایک ثابت شدہ بنیاد فراہم کر دی۔

اسی کے ساتھ جدید سائنس نے دوسری بات یہ ثابت کی کہ زمین میں یا وسیع خلا میں جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب کی سب بے بس مخلوق ہیں۔ سب کی سب ایک محکم قانون فطرت میں بندھی ہوئی ہیں۔ انھیں کسی بھی درجہ میں کوئی ذاتی اختیار یا اقتدار حاصل نہیں۔

اسی کے ساتھ ایک اور بات ثابت ہوگئی جو عقیدۂ شرک کے سراسر خلاف اور عقیدۂ توحید کے سراسر موافق ہے۔ وہ یہ کہ ساری کائنات اپنے تمام مختلف اجزا کے ساتھ ایک ہی قانون فطرت کے تحت چل رہی ہے جس کو سائنس داں اپنی زبان میں واحد ڈوری (single string) سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خود علم انسانی کی دریافتوں کے مطابق کائنات کا صرف ایک خدا ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی خدا ہے اور نہ کوئی معبود۔ شرک کی اصل توہماتی طرز فکر (superstitious thinking) میں ہے۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی تحقیقات نے قدیم زمانہ کے توہمات (superstitions) کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ اس طرح شرک کی جڑیں موجودہ زمانہ میں خالص علمی اعتبار سے ختم ہو گئیں۔ اب کوئی سائنٹفک ذہن (scientific mind) شرک کو بطور حقیقت ماننے کے لئے تیار نہیں۔ تاہم ابھی تک شرک کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا۔

پہلے زمانہ میں انسان یہ عقیدہ قائم کئے ہوئے تھا کہ فلاں فلاں دیوی دیوتا ہیں جو ہوائیں چلاتے ہیں، جو بارش برساتے ہیں، جو پراسرار طور پر ان واقعات کے پیچھے کام کر رہے ہیں جن کو ہم صبح و شام دیکھتے ہیں۔ مگر اب سائنسی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ سب واقعات معلوم فطری قوانین (laws of nature) کے تحت ظہور میں آتے ہیں۔ وہ کسی پراسرار دیوی یا دیوتا کا کرشمہ نہیں۔ اس طرح قدیم طرز کے شرک کا اب بڑی حد تک خاتمہ ہو چکا ہے۔

ایک جاہل اور بے خبر شخص نے جب پہلی بار ایک کار کو دوڑتے ہوئے دیکھا تو اس نے سمجھا کہ یہ کوئی جادوگر ہے جو اپنے لوہے کے کمرہ کو جادو کے زور پر دوڑا رہا ہے۔ مگر ایک باخبر انجینئر اس قسم کی بات کو مضحکہ خیز سمجھے گا۔ کیوں کہ اس کو یقین ہو گا کہ ایسا کوئی جادو واقعہ

میں موجود ہی نہیں۔

اسی طرح مشرکانہ عقائد یا فرضی معبودوں کا نظام موجودہ زمانہ کے ایک تعلیم یافتہ انسان کے لئے پوری طرح مضحکہ خیز بن چکا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ بارش کا برسنا یا فصل کا اگنا اور اس طرح کے دوسرے واقعات تمام تر فطرت کے اصولوں پر مبنی (based) ہیں۔

قدیم توہماتی دور میں شرک کا عقیدہ قابل قبول ہو سکتا تھا۔ مگر اب ترقی یافتہ علم کے زمانہ میں شرک کا پورا ڈھانچہ عقیدہ سے لے کر عمل تک، سراسر بے اصل قرار پا چکا ہے۔ ترقی یافتہ زمانہ میں شرک کا جو حال ہوا اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی اندھیرے کمرے کے بارے میں یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کے اندر بڑی بڑی سینگوں والا کوئی خطرناک عفریت بیٹھا ہوا ہے۔ مگر جب کمرہ کو روشن کیا جائے تو معلوم ہو کہ وہاں ایسی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہ تھی۔

سائنس کے ظہور سے پہلے دنیا میں توہماتی خیالات کا غلبہ تھا۔ اس وقت کم فہمی کے تحت لوگ شرک کے فریب میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ مگر اب سائنس کی روشنی پھیل جانے کے بعد اس کا امکان ختم ہو گیا ہے کہ شرک دوبارہ لوگوں کے ذہن میں اپنی جگہ بنا سکے۔

تاہم خود توہمات کا ابھی تک خاتمہ نہیں ہوا۔ ذاتی زندگی میں آج بھی ساری دنیا میں کروروں لوگ پراسرار قسم کے توہمات میں یقین رکھتے ہیں۔ اہل علم طبقہ کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو دیوی دیوتاؤں کو تو نہیں مانتی مگر اب بھی وہ خدائے واحد تک نہیں پہنچی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی پچھلی نسلیں اگر دیوی دیوتاؤں میں اٹکی ہوئی تھیں تو اب قانون فطرت کے نام سے انھوں نے ایک اور معبود کو فرض کر لیا ہے اور اس کو اپنے ذہن میں اسی طرح بٹھائے ہوئے ہیں جس طرح قدیم انسان دیوی دیوتاؤں کو بٹھائے ہوئے تھا۔

اس طرح انسانی تاریخ گردش کرتے ہوئے اب ایک ایسے دور میں پہنچ گئی ہے جب کہ پیغمبروں کی تحریک کے راستہ کی تمام رکاوٹیں ختم ہو گئی ہیں۔ آج رد شرک اور اثبات توحید کی

تحریک کو آزادانہ طور پر اور انتہائی موثر انداز میں برپا کیا جاسکتا ہے۔ دور جدید میں سیاسی اور بین اقوامی فضا بھی پوری طرح اس کے موافق ہو چکی ہے۔ تمام علمی دلائل اسی کی تائید کر رہے ہیں۔ حتی کہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ آج توحید کی تحریک بلا مقابلہ کامیابی (unopposed victory) حاصل کرنے کی پوزیشن میں پہنچ گئی ہے۔ اس کے راستہ میں اب کسی بھی قسم کی کوئی رکاوٹ حائل نہیں اب ضرورت ہے کہ اہل توحید نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ اٹھیں اور دنیا کی تمام قوموں کو نئی طاقت کے ساتھ توحید کی حیات بخش حقیقت سے آشنا کر دیں۔

قدیم زمانہ میں انسانی زندگی میں اور انسانی سماج میں بے شمار برائیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کے نتیجہ میں انسان اپنی فطری عظمت سے محروم ہو گیا تھا۔ یہ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ اٹھائی ہوئی تحریک توحید تھی جس نے دنیا کو اس المناک دور سے نکالا اور انسانیت کو حقیقی معنی میں ترقی کے دور میں داخل کیا۔ انسان پہلی بار ان سعادتوں سے ہمکنار ہوا جو خدا نے اس کے لئے مقدر کی تھیں مگر خود ساختہ توہمات کے نتیجہ میں اس نے اپنے آپ کو ان سے محروم کر رکھا تھا۔ انسانیت تاریکی کے طویل دور سے نکل کر روشنی کے نئے دور میں داخل ہو گئی۔ اب بظاہر مادی ترقیوں کے باوجود انسان دوبارہ مسائل کے اندھیروں میں گرفتار ہو گیا ہے۔ خوشنما تمدن کے اندر وہ حقیقی خوشی اور سکون سے محروم ہے۔ انسان کی فطری عظمت دوبارہ پستیوں کے نئے کھڈ میں جا گری ہے۔

اب ضرورت ہے کہ توحید کی دعوت کو از سر نو نئی طاقت کے ساتھ زندہ کیا جائے۔ ایک طرف اس کے نئے دلائل اور نئے اسلوب کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ قابل قبول بنایا جائے اور دوسری طرف جدید ذرائع اشاعت کو استعمال کر کے اس کو ساری دنیا میں پھیلا دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جس کو پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی ایک تاریخی پیشین گوئی میں اس طرح فرمایا تھا کہ ـــــ ایک وقت آئے گا جب کہ خدا کے دین کا پیغام ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔ کوئی گھر یا خیمہ ایسا نہ بچے گا جس کے اندر توحید کا کلمہ پہنچ نہ گیا ہو۔

باب دوم

حقیقی دین وہی ہے جو آدمی کے اندر نرمی کا مزاج پیدا کرے۔ جو ہر حال میں محبت اور خیر خواہی کی تعلیم دیتا ہو۔

مذہبِ امید

اسلام امید کا مذہب ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات امید اور حوصلہ کا سبق دیتی ہیں۔ بظاہر مشکل اور ناکامی اور محرومی جیسے حالات میں بھی اسلام انسان کو امید اور حوصلہ کا سبق دیتا ہے۔ وہ شام کے اندھیرے میں بھی صبح کی روشنی کی خوشخبری سناتا ہے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ: وترجون من اللہ ما لا یرجون (النساء ۱۰۴) یعنی اور تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو امید وہ نہیں رکھتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک شخص جو اسلامی فکر کا حامل ہو وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو تاریکی میں روشنی دیکھتا ہے، جو وہاں بھی پر امید رہتا ہے جہاں دوسرے لوگ امید اور حوصلہ کھو بیٹھتے ہیں۔

اس معاملے میں اسلام اس حد تک جاتا ہے کہ اسلام میں مایوسی کو حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ قرآن میں ایک پیغمبر کی زبان سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ: ولا تیئسوا من روح اللہ انّہ لا یایئس من روح اللہ الا القوم الکافرون ٥ (یوسف ۸۷) یعنی تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، اللہ کی رحمت سے صرف منکر ہی ناامید ہوتے ہیں۔ اس کے مطابق، اہل اسلام کے لئے کسی بھی حال میں جائز نہیں کہ وہ مایوس ہو جائیں۔ حالات بظاہر خواہ کتنے ہی زیادہ غیر موافق ہوں مگر اہل ایمان پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ آخر وقت تک پر امید بنے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں خودکشی کی موت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

سچائی کا یقین

موجودہ دنیا میں آدمی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اس یقین پر قائم ہو کہ اس نے سچائی کو پالیا ہے۔ وہ جس راستہ پر چل رہا ہے اس کے حق ہونے پر اسے کوئی شبہ نہ ہو۔ اس قسم کا یقین آدمی کی لازمی ضرورت ہے۔ یہی یقین آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان معتدل طور پر رہے۔ اس کو ذہنی سکون حاصل ہو۔ وہ رات کو اطمینان کی نیند سوئے اور دن کو

اعتدال کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے۔ اسلام آدمی کو یقین کی یہی نعمت عطا کرتا ہے۔

ایک پہاڑ یا ایک جانور کی یہ ضرورت نہیں کہ وہ دنیا میں اپنے وجود کا جواز تلاش کرے۔ مگر انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ یہ جانے کہ وہ کیا ہے۔ اور وہ کس مقصد کے تحت دنیا میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس کو ایک لفظ میں زندگی کا نظریہ (آئیڈیالوجی) کہا جا سکتا ہے۔

فلسفہ اس نظریۂ حیات کی تلاش کا علم ہے۔ مگر پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ مدت کی تلاش کے باوجود ابھی تک فلسفہ اپنی تلاش کا جواب نہ پا سکا۔ فلسفہ اپنے آخری مرحلہ میں پہنچ کر انسان کو صرف تشکیک اور بے یقینیت دینے میں کامیاب ہوا ہے۔ فلسفہ کے بعد سائنس کا درجہ آتا ہے مگر سائنس نے پیشگی طور پر یہ مان لیا ہے کہ وہ حقیقت کا صرف جزئی علم دے سکتی ہے، کلی حقیقت تک پہنچنا سائنس کے لئے ممکن ہی نہیں۔

گویا سائنس نے خود ہی یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ مقابلہ کے میدان میں اترنے کی سرے سے اہل نہیں۔ اب آخری چیز جس سے اس معاملہ میں رجوع کیا جائے وہ مذہب ہے۔ یہاں بھی منظر زیادہ مختلف نہیں۔ بظاہر دنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ مگر اسلام کے سوا تمام مذاہب کی حالت بلا استثناء یہ ہے کہ ان کو نہ علمی تائید حاصل ہے اور نہ تاریخی اعتباریت۔ ان مذاہب کی مقدس کتابیں تحریف کی بنا پر صحیح باتوں کے ساتھ غلط باتوں کا مجموعہ بن گئی ہیں۔

اسی طرح ان کے تاریخی حالات اتنے کم معلوم ہیں کہ خالص علمی اور عقلی اعتبار سے ان کی سچائی پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح یہ تمام مذاہب بھی عملی طور پر اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ انسان کو وہ سچائی دے سکیں جس پر وہ کامل یقین کے ساتھ قائم ہو جائے۔

افکار کے اس جنگل میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو نہ صرف کامل سچائی کا حامل ہے بلکہ واقعاتی اعتبار سے وہ ایک ایسا مذہب ہے جس کی تاریخی اعتباریت میں کوئی شبہ نہیں۔

اسلام انسان کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جو غیر مشتبہ سچائی کا حامل ہے۔ جو کلی صداقت کا سرمایہ اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ جو اپنی تاریخی نوعیت کے اعتبار سے اس

قابل ہے کہ انسان اس یقین کے ساتھ اس کو اختیار کر سکے کہ اس نے اس سچائی کو پالیا ہے جس کی تلاش اس کی فطرت میں پیشگی طور پر موجود تھی۔

اسلام ایک متلاشی روح کا حقیقی جواب ہے۔ وہ انسان کی شخصیت کی تکمیل ہے۔ وہ انسان کو وہ غیر متزلزل یقین دیتا ہے جس کے سہارے وہ دنیا میں زندہ رہ سکے۔ اسلام آدمی کی قبل از موت زندگی کو بھی بامعنی بناتا ہے اور اس کی بعد از موت زندگی کو بھی۔

زندگی ایک قیمتی موقع

زندگی اگر صرف وہی ہے جو موجودہ دنیا میں ہر آدمی کو ملتی ہے تو بلا شبہ وہ اتنی زیادہ بے معنی ہے کہ اس سے زیادہ بے معنی چیز اور کوئی نہیں۔ انسان لامحدود صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں وہ اپنی ان صلاحیتوں کا پانچ فیصد حصہ بھی استعمال نہیں کرپاتا کہ وہ مر جاتا ہے۔ انسان کے اندر تمناؤں اور آرزوؤں کی ایک کائنات بسی ہوئی ہے۔ مگر کوئی بھی شخص اپنی ان تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل اس دنیا میں نہیں کرپاتا۔ تمام موجودات اور مخلوقات میں انسان واحد مخلوق ہے جو مستقبل کا تصور رکھتا ہے۔ مگر تمام انسان ابھی اپنے حال میں ہوتے ہیں کہ ان کی دنیوی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، بغیر اس کے کہ انھوں نے اپنے مستقبل کو پایا ہو۔ ہر انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے کامیاب زندگی کا حریص ہے، مگر یہاں کوئی بھی انسان اپنی کامیابی کو نہیں پاتا۔ بظاہر انسان کے لئے صرف یہ المناک انجام مقدر ہے کہ وہ اپنی کامیابی کی تاریخ بنانے سے پہلے اس دنیا سے چلا جائے۔

اسلام اس اندھیرے میں انسان کے لئے ایک روشنی ہے۔ اسلام کا جنت کا تصور آدمی کو یہ بتاتا ہے کہ کس طرح وہ اپنی ناکامی کو کامیابی سے بدلے۔ کس طرح وہ اپنے خوابوں کے اس مستقبل کا مالک بنے جہاں وہ اپنی شخصیت کی تکمیل (fulfillment) کو پاسکے۔

حقیقت کا یہ انکشاف جو اسلام کے ذریعہ کیا گیا ہے وہ ہر آدمی کے لئے زندگی کو ایک قیمتی موقع بنا دیتا ہے۔ اب ہر آدمی ایک مطلوب منزل دریافت کر لیتا ہے جس کی طرف وہ چل سکے۔

ہر آدمی ایک ایسے نشانے کو جان لیتا ہے جس کو وہ اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز توجہ بنالے۔

دونوں حالتوں میں صبر

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **عجبت من قضاء الله عزوجل للمؤمن ان اصابه خير حمد ربه و شكر وان اصابته مصيبة حمد ربه وصبر المومن يوجر في كل شيء** (مسند الامام احمد بن حنبل ۱؍۱۷۳) یعنی مومن کے معاملے میں اللہ کا فیصلہ کیسا عجیب ہے۔ اگر اس کو بھلائی پہونچتی ہے تو وہ حمد کرتا ہے اور شکر کرتا ہے اور اگر اس کو کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ حمد کرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ اس طرح مومن کو ہر چیز میں اجر ملتا رہتا ہے۔

مومن سے مراد وہ انسان ہے جس کا شعور پوری طرح بیدار ہو چکا ہو جس کی سوچ اس حد تک ترقی کر چکی ہو کہ وہ ہر پیش آنے والی صورت حال پر مثبت جواب (positive response) دے سکے۔ وہ قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر حقائق کو دیکھنے والا بن چکا ہو۔ یہی وہ انسان ہے جس کا ذکر اوپر کی حدیث میں کیا گیا ہے۔

ایسے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کو کوئی پسندیدہ چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ اس غلط فہمی میں نہیں پڑتا کہ یہ اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا کے قائم کردہ نظام کی بنا پر ممکن ہوا ہے۔ یہ چیز اس کو حقیقت پسند بناتی ہے اور اس کو نظام خداوندی کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی طرح اگر اس کو کوئی ناخوشگوار تجربہ پیش آئے تب بھی اس کا ترقی یافتہ شعور اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ اس کا ذہنی سکون نہ ٹوٹے۔ وہ فریاد یا شکایات کے بجائے صبر و تحمل کے ساتھ اس کا سامنا کرے۔

موجودہ دنیا میں یہ مزاج آدمی کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ حالات کے اتار چڑھاؤ کے باوجود وہ ہمیشہ اعتدال پر قائم رہے۔ وہ ہر نہیں میں اپنے لئے ایک ہے کا راز دریافت کرلے۔ اس کی زندگی کبھی تعطل سے دوچار نہ ہو۔ اس کی امیدوں کا چراغ کبھی

بجھنے نہ پائے، وہ اس کو ہمیشہ روشنی اور حرارت دیتا رہے۔

دشمن میں دوست

قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ میں ارشاد ہوا ہے ــــــ اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ (حم السجدہ ۳۳۔۳۴)

کسی سے دشمنی ہو جائے یا کسی آدمی کو ایک شخص اپنا دشمن نظر آئے تو اس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ یہ میرا دشمن ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کو تباہ کر دیا جائے۔ مگر اسلام ایسے معاملے میں بھی ایک امید افزا پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ تمہارے دشمن کے اندر تمہارا ایک دوست چھپا ہوا ہے۔ اس دوست کو دریافت کرو، اور پھر تمہارا دشمن تمہارا قریبی ساتھی بن جائے گا۔

دوستی یا دشمنی کوئی پیدائشی صفت نہیں۔ کوئی آدمی پیدائشی طور پر کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔ اگر ایک شخص آپ کو اپنا دشمن نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ یہ اس کی ایک مصنوعی حالت ہے۔ آپ اپنے میٹھے بول اور اپنے حسن سلوک سے اس کو ایک نیا انسان بنا سکتے ہیں۔ آپ اپنے دوستانہ عمل سے اس کو اس حد تک بدل سکتے ہیں کہ آپ کے خلاف اس کی ضد اور نفرت ختم ہو جائے۔ جو شخص اب تک بظاہر آپ کا غیر بنا ہوا تھا وہ آپ کا اپنا بن جائے۔

یہ ہر انسان کے لئے ایک عظیم خوشخبری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بہتر امکانات کی فہرست اتنی لمبی ہے جو دشمن تک کو دوست کے خانہ میں درج کئے ہوئے ہے۔ یہ اسلامی تعلیم آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ کانٹے کو بھی پھول کے روپ میں دیکھے، وہ مخالف انسان میں بھی اپنا ایک موافق انسان پالے۔ یہ خود فطرت کا ایک اٹل قانون ہے نہ کہ سادہ طور پر محض ایک مذہبی عقیدہ۔

صبر کا فائدہ

ایک حدیث قدسی کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إذا ابتلیت عبدی بحبیبتیه فصبر عوضته منهما الجنة (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۰/۱۲۰) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں اپنے کسی بندے کو اس کی دو محبوب چیزوں سے آزماتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو میں اس کو اس کے بدلے جنت دے دیتا ہوں۔ راوی کہتے ہیں کہ دو محبوب چیزوں سے مراد دو آنکھیں ہیں۔

دو آنکھوں کی محرومی پر صبر کا جو انعام کسی کو خدا کی طرف سے ملتا ہے اس کا تعلق صرف جنت سے نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے انسان کا انعام موجودہ دنیا ہی سے شروع ہو جاتا ہے جس کی آخری اور تکمیلی صورت یہ ہے کہ اس کو جنت میں داخلہ مل جائے۔ ایسا انسان دنیا میں نابینا ہونے کے باوجود کامیاب رہتا ہے اور آخرت میں مزید اضافہ کے ساتھ بینا بھی اور کامیاب بھی۔

دونوں آنکھوں کی محرومی پر جب ایک آدمی صبر کرلے تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ اس کی اندرونی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس کی داخلی شخصیت میں ایک نیا نفسیاتی عمل شروع ہو جاتا ہے جو اس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس کے دماغ کی وہ مخصوص کھڑکیاں کھل جاتی ہیں جو خالق فطرت نے صرف اس لئے اس کے اندر رکھی ہیں تاکہ وہ ایمرجنسی کے وقت اس کے کام آئیں۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان کے دماغ میں بہت سے خانے ایسے ہیں جو عام حالات میں بالکل بند رہتے ہیں۔ وہ صرف اس وقت کھلتے ہیں جب کہ انسان کسی ہنگامی حالت سے دوچار ہو جائے۔ صبر انھیں بند دروازوں کو کھولنے کی کنجی ہے۔ ایسے حادثے کے موقع پر جو لوگ غم اور فریاد کا شکار ہو جائیں، ان کے دماغ کے یہ ہنگامی خانے بدستور بند پڑے رہیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ ایسے موقع پر صبر کا مثبت رسپانس (positive response) دیں وہ

فطرت کو اپنا عمل کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظاہری آنکھوں سے محروم ہو کر وہ داخلی آنکھوں کی صورت میں اس کا بدل پالیتے ہیں۔

راقم الحروف نے خود اپنی زندگی میں کئی ایسے افراد کو دیکھا ہے۔ مثال کے طور پر بھوپال کے جناب الطاف احمد صاحب طویل عرصے سے بینائی سے محروم ہیں مگر وہ اپنے تمام کام معمول کے مطابق اور کامیابی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ کے ایک سفر میں میری ملاقات ڈاکٹر ایوب لبنانی سے ہوئی۔ وہ ٹمپل ٹن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور اپنے تمام کام بالکل معمول کے مطابق انجام دیتے ہیں۔ حتی کہ مشین کی مدد سے وہ کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔

آنکھ انسان کی تمام قیمتی چیزوں میں سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جب آنکھ جیسی قیمتی چیز سے محرومی پر صبر سے انسان کو نئی زندگی ملتی ہے تو دوسری محرومیوں پر صبر سے بدرجہ اولیٰ اس کو یہ چیز حاصل ہوگی۔ صبر ایک ایسی نعمت ہے جو کسی انسان کی ہر محرومی میں اس کا مددگار ہے۔ صبر کسی انسان کے لئے کھونے کو دوبارہ پانا بنا سکتا ہے۔

موت خاتمۂ حیات نہیں

موجودہ دنیا میں انسان کے ساتھ جو حادثات پیش آتے ہیں ان میں سب سے بڑا حادثہ موت کا حادثہ ہے۔ موت ہر شخص کی زندگی میں ایک ایسا فیصلہ کن زلزلہ ہے جس سے بچنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ کوئی بھی تدبیر اتنی طاقتور نہیں جو موت کو ٹالنے میں کار آمد ہو سکے۔ موت کا شکار ہر آدمی لازمی طور پر ہوتا ہے خواہ وہ غریب ہو یا امیر، خواہ وہ بے زور ہو یا زور آور۔

یہی وجہ ہے کہ ہر دور کا انسان موت کے بارے میں انتہائی سنجیدگی سے سوچتا رہا ہے۔ موت کی یاد ہر آدمی کی خوشیوں کے چراغ کو بجھا دیتی ہے۔ ہر آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا پیدا کرنے والے نے مجھ کو اسی لئے پیدا کیا تھا کہ میں چند سال زندہ رہ کر ختم ہو جاؤں، ایک محدود مدت دنیا میں گزار کر اس طرح یہاں سے جاؤں کہ میری کوئی بھی کامیابی موت کے اس

سفر میں میرے ہمراہ نہ ہو۔

اس معاملے میں اسلام ہر انسان کے لئے امید کا ایک چراغ ہے۔ اسلام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا جو تخلیقی منصوبہ انسان پر منکشف کیا ہے وہ بتاتا ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، موت دراصل ایک درمیانی وقفہ ہے جس کے بعد آدمی اپنے اگلے مرحلۂ حیات میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس دوسرے مرحلۂ حیات میں انسان اسی طرح ایک زیادہ کامل اور وسیع دنیا میں جئے گا جس طرح وہ موجودہ دنیا میں نسبتاً بہت مختصر اور کمتر زندگی گزار رہا تھا۔

اسلام کے ذریعہ یہ خبر جو انسان کو دی گئی ہے وہ ہر مرد و عورت کے لئے زندگی کا نیا پیغام ہے۔ اس خبر کی صورت میں آدمی اس امکان کو دریافت کرتا ہے کہ وہ اگلی دنیا کے قوانین کو جانے اور اس کے مطابق زندگی گزارے تاکہ وہ موت کے بعد دوبارہ ایک نئی اور زیادہ بہتر زندگی پالے۔ اس تخلیقی منصوبہ سے بے خبری انسان کو اپنی زندگی کے بارے میں مایوسی میں مبتلا کرتی ہے۔ مگر جب وہ اس تخلیقی منصوبہ کو جان لے تو اس کے بعد اس کے سامنے زندگی کا نیا وسیع تر دروازہ کھل جاتا ہے۔ وہ بظاہر اپنی محرومی میں ایک نئی یافت کا راز پا لیتا ہے۔

ایک انوکھی خوشخبری

قرآن کی سورۃ نمبر ۳۹ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "تم کہہ دو کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔" (الزمر ۵۳)

قرآن کی یہ آیت انسان کے لئے ایک عظیم خوشخبری ہے۔ موجودہ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہر آدمی سے طرح طرح کی کوتاہیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ ان گناہوں کا انجام اگر لازمی طور پر بھگتنا ہو تو انسان کے لئے زندگی کتنی بڑی مصیبت بن جائے۔ مگر خدا کی کتاب انسان پر یہ راز کھولتی ہے کہ اس کے لئے اس معاملہ میں مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔

گناہوں سے معافی کا یہ راز کیا ہے۔ وہ ہے گناہ پر شرمندگی اور اللہ کی طرف دوبارہ رجوع

کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح کچھ اعمال کو گناہ قرار دیا ہے اسی طرح اس نے اس دنیا میں امکان بھی رکھ دیا ہے کہ گناہ سرزد ہونے کے بعد آدمی اپنے کو اس سے پاک وصاف کر سکے۔ وہ خدا کی دنیا میں ایک بے گناہ انسان کی حیثیت سے داخل ہو۔

قرآن کی ایک اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کے لئے یہ عجیب امکان بھی رکھا ہے کہ اس کا گناہ بدل کر اس کے لئے نیکی بن جائے (الفرقان ۷۰)۔ وہ اس طرح کہ گناہ کے بعد جب آدمی شرمندہ ہوتا ہے اور گریہ وزاری کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ گویا ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جب کہ اس کا گناہ اس کے لئے ایک نیکی کا سبب بن گیا۔ ابتداءً اگر وہ خدا سے دور ہوا تھا تو بعد کے مرحلہ میں وہ خدا سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔ اس کی یہ روش خدا کو اتنا زیادہ پسند آتی ہے کہ اس کے گناہ کو بھی نیکی کے خانہ میں لکھ دیا جاتا ہے۔

خدا کا یہ قانون جو قرآن کے ذریعہ کھولا گیا ہے انسان کے لئے ایک عجیب نعمت ہے۔ وہ انسان کے لئے لازوال تسکین کا سرمایہ ہے۔

قناعت ایک نعمت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **قد افلح من أسلم ورزق كفافاً وقنعه الله بما آتاه** (مسند الامام احمد ۲/۱۶۸) یعنی وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اسلام قبول کیا اور اس کو بقدر ضرورت روزی ملی اور اللہ کی توفیق سے وہ اس پر قانع رہا جو اللہ نے اس کو دیا تھا۔

موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان اونچ نیچ رہتی ہے۔ اس بنا پر اکثر انسان سکون سے محروم زندگی گزارتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو دیکھتے رہتے ہیں جن کو ان سے زیادہ ملا ہوا ہے۔ اس طرح وہ مسلسل طور پر ایک قسم کی حسرت کی نفسیات میں مبتلا رہتے ہیں اور اسی حال میں مر جاتے ہیں۔

اس کا حل اسلام میں قناعت بتایا گیا ہے۔ قناعت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ملے

ہوئے پر مطمئن رہے اور نہ ملے ہوئے کے غم میں اپنے آپ کو ہلکان نہ کرے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق دنیا میں ہر ایک کو وہی ملتا ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ جس آدمی کو کم ملا وہ بھی خدا کے حکم سے تھا اور جس کو زیادہ ملا وہ بھی خدا کے حکم سے تھا۔

یہ عقیدہ آدمی کو ابدی سکون عطا کرتا ہے۔ وہ اس یقین میں جینے لگتا ہے کہ اس کو جو کچھ ملا وہ اتفاقاً نہیں تھا بلکہ یہ عین وہی ہے جو خود اس کی بہتری کے لئے اس کو ملنا چاہئے تھا۔ اگر ایک شخص کو بظاہر دنیا کا رزق کم ملا ہے تو یہ اس کے حق میں خدا کی ایک عظیم مہربانی ہے۔ اس طرح خدا چاہتا ہے کہ وہ شخص ظاہری ساز و سامان میں زیادہ مصروف نہ ہو سکے۔ وہ خارجی ظواہر سے بلند ہو کر معنوی حقائق میں زیادہ سے زیادہ مشغول ہو۔

مادّی چیزوں میں کم پر راضی ہونے کا نام قناعت ہے۔ اسی طرح مادی چیزوں میں زیادہ کا طالب بننے کا نام حرص ہے۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ جو آدمی قناعت کی روش پر قائم ہو اس پر ہر قسم کے علمی دروازے کھلتے چلے جائیں گے، اس پر معرفت اور روحانیت کی بارشیں ہوں گی۔ اس کے برعکس جو آدمی حرص و ہوس کا طریقہ اختیار کرے وہ ظواہر کی محدود دنیا میں گم ہو کر رہ جائے گا۔ حقائق کی وسیع تر دنیا اس کی دسترس سے باہر ہوگی۔ وہ ایک خوشنما حیوان کی طرح زندگی گزارے گا، وہ انسانیت کا اعلیٰ درجہ پانے سے محروم رہے گا۔

کم پر قناعت کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ جو آدمی مادّی چیزوں میں کم پر راضی ہو جائے وہ گویا غیر مادّی چیزوں میں اپنے آپ کو زیادہ کا مستحق بنا رہا ہے۔ وہ غیر اہم چیزوں میں پیچھے کی سیٹ کو قبول کر کے زیادہ اہم چیزوں میں آگے کی سیٹ پر اپنے لئے زیادہ بہتر جگہ حاصل کر رہا ہے۔

تکلیف میں راحت

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: مایصیب المسلم من نصب ولا وصب ولا همّ ولاحزن ولا اذی ولاغم ــ حتی الشوکة یشاکها ـــ الا کفّر الله بها من خطایاه.

(فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۰۷/۱۰) یعنی جب بھی کسی مسلم پر کوئی تھکان یا درد یا رنج یا حزن یا تکلیف یا غم پہنچتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی کانٹا بھی چبھتا ہے تو اللہ ضرور ان مصیبتوں کو اس کی خطاؤں کے لئے کفارہ بنادیتا ہے۔

یہاں مسلم سے مراد وہ انسان ہے جس کو حقیقت کی پہچان ہو گئی ہو۔ جو چیزوں کو اس کے صحیح رخ سے دیکھنے کے قابل ہو جائے، جو خدا کی خدائی کو دریافت کرلے اور اسی کے ساتھ انسان کی انسانیت کو بھی۔

ایسا انسان اپنی حقیقت شناسی کی بنا پر وہ انسان بن جاتا ہے جو ہر آنے والی صورت حال کا صحیح جواب (response) دے سکے۔ ایسے انسان پر جب کوئی چھوٹی یا بڑی مصیبت آتی ہے تو وہ اس کی سوچ کو جگانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ایسے تجربات کے درمیان وہ اپنے عجز کو دریافت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصیبت کے وقت فریاد اور شکایت کرنے کے بجائے وہ قادر مطلق خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ ان تجربات کے درمیان وہ اپنی حیثیت واقعی کا ادراک کرلیتا ہے۔

اس معاملے کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مسلم وہ ہے جو زندگی کے تلخ تجربات کو منفی معنوں میں لینے کے بجائے ان کو مثبت معنوں میں لے سکے۔ مسلم انسان کی یہ صفت اس کے لئے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کا محرک بن جاتی ہے۔ دنیا کی ہر ٹھوکر اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملے پر ازسر نو غور کرے۔ وہ اپنا احتساب آپ کرنے لگے۔ اصلاحِ خویش کے اس عمل کا دینی نام کفارہ ہے۔

اسلام کا یہ اصول انسان کے لئے ایک عظیم خوش خبری ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو بار بار مختلف قسم کی مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ آدمی اگر باشعور نہ ہو تو دنیا کی مصیبت اس کے لئے صرف مصیبت یا تکلیف ہوگی، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مگر جو انسان صاحب معرفت ہو، جس کے ایمان نے اس کو باشعور بنادیا ہو وہ اس پوزیشن میں ہو جاتا ہے کہ اپنی تکلیف کو بھی راحت بنا سکے، اپنے نہیں کو ہے میں تبدیل کرسکے۔ وہ کھونے کو بھی اپنے لئے پانا بنالے۔

اسلام کا یہ تصور انسان کے لئے ایک عظیم نعمت ہے، وہ تکلیف کے احساس کو بھی راحت کے احساس میں بدل دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی پر جب کوئی چھوٹی یا بڑی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کبھی گھبراہٹ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ ہر مصیبت کے موقع پر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس مصیبت نے میری زندگی کی کسی غلطی کو میرے اعمال کے ریکارڈ سے مٹادیا۔ مجھے قصوروار انسان کے مقام سے اٹھا کر بے قصور انسان کی صف میں پہونچادیا۔

توکل اور اعتماد

اسلام کی ایک اہم تعلیم وہ ہے جس کو توکل علی اللہ کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر حال میں اللہ کے اوپر بھروسہ رکھنا، اللہ کی رحمت سے کبھی ناامید نہ ہونا، قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ "اور تم اللہ پر توکل کرو، اور اللہ کارساز ہونے کے لئے کافی ہے (الاحزاب ۳) دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تم اللہ پر توکل کرو اگر تم مومن ہو۔ (المائدہ ۲۳) اسی طرح قرآن میں اہل حق کی زبان سے کہا گیا ہے کہ "اور جو تکلیف تم ہمیں دوگے ہم اس پر صبر کریں گے، اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے"۔ (ابراھیم ۱۲) اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تم اس طرح کہو کہ "اللہ میرے لئے کافی ہے، بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ (الزمر ۳۸)

توکل کا عقیدہ امید اور یقین کا لازوال سرچشمہ ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو یہ یقین عطا کرتا ہے کہ جہاں تمہاری کوششوں کی حد آجائے وہاں ایک اور ہستی تمہاری مدد کے لئے موجود رہتی ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ جہاں معلوم اسباب ختم ہو گئے ہوں وہاں نامعلوم اسباب کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذریعہ تمہارا ساتھ دینے کا انتظار کر رہا ہے۔ جہاں تم اپنی طاقت سے کامیاب نہیں ہو سکتے وہاں تمہارا خدا اپنی لامحدود طاقتوں کے ساتھ تم کو کامیاب بنانے کے لئے موجود ہے۔

توکل کا یہ عقیدہ اہل ایمان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ وہ آدمی کو یہ یقین عطا کرتا ہے کہ بظاہر حوصلہ شکن حالات میں بھی اس کا حوصلہ نہ ٹوٹے۔ بظاہر ناامیدی کے طوفان میں بھی وہ اپنی

امید کو بر قرار رکھے۔

اس پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ ایک شخص کا اسلام کے عقیدہ پر کھڑا ہونا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اٹل حوصلہ کی زمین پر کھڑا ہونا ہے۔ یہ نا قابل شکست عزم کی چٹان پر کھڑا ہونا ہے۔ یہ ایک ایسی برتر امید پر کھڑا ہونا ہے جو طوفانی حالات میں بھی آدمی کو مایوسی سے بچائے رکھے۔ جو اس کو ہر حال میں عزم وہمت کا پیکر بنائے رہے۔

ناخوش گواری میں خوش گوار پہلو

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں فطرت کا ایک قانون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وعسى ان تكرهوا شيئاً وهو خير لكم وعسى ان تحبّوا شيئاً و هو شر لكم والله يعلم و انتم لاتعلمون ٥ (البقرة ٢١٦)** یعنی ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لئے بھلی ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

انسان ایک ایسی دنیا میں جیتا ہے جہاں اس کے سوا بے شمار دوسرے اسباب ہیں جو رات دن اپنا کام کر رہے ہیں۔ موجودہ دنیا میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ زیادہ تر انھیں خارجی اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو اس کی خواہش یا اس کے اپنے منصوبہ کے خلاف ہو۔ اگر آدمی زیادہ باشعور نہ ہو تو وہ ایسے واقعات کو دیکھ کر گھبرا جائے گا۔ وہ اپنے کو ایک مصیبت زدہ یا ناکام انسان سمجھ لے گا۔

قرآن کے مذکورہ بیان میں ایسے انسان کے لئے ایک عظیم رہنمائی ہے۔ یہ رہنمائی انسان کو ایک مستقل سکون عطا کرتی ہے۔ وہ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ مصیبت کے لمحات میں بھی یہ سوچ کر مطمئن رہے کہ اس مصیبت میں بھی یقیناً راحت کا کوئی پہلو چھپا ہوا ہو گا۔ وہ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ مشکل لمحات میں بھی وہ انتظار کی پالیسی اختیار کرے۔ وہ اپنے ناخوشگوار حال میں ایک خوشگوار مستقبل کا منظر پیشگی طور پر دیکھنے لگے۔

ایسا انسان اپنے اس مزاج کی بنا پر ایک بے پناہ انسان بن جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت یا اپنے وجود کا کوئی حصہ بے فائدہ طور پر ضائع نہ ہونے دے۔ وہ اس المناک انجام سے محفوظ رہے کہ ایک ناخوشگوار صورت حال سے متاثر ہو کر وہ اپنے آپ کو ہلاک کر لے، حالانکہ آئندہ آنے والے حالات اس کے لئے ایسی خبریں لائیں جو عین اس کے حق میں ہوں اور مزید اضافے کے ساتھ ٹھیک وہی ہو جس کو وہ اپنے لئے چاہ رہا تھا۔

کمزور اور طاقتور

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص کے یہاں دو بھائی تھے۔ ایک بھائی گھر کا کاروبار سنبھالتا تھا اور دوسرا بھائی دینی کاموں میں مصروف رہتا تھا۔ پہلے بھائی نے رسول اللہ ﷺ سے دوسرے بھائی کی شکایت کی اور کہا کہ وہ گھر کے کاروبار میں حصہ نہیں لیتے۔ آپ نے فرمایا کہ شاید تم کو اُسی کی وجہ سے روزی مل رہی ہو۔ (لعلك ترزق به) اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: إنماتنصرون و ترزقون بضعفائكم (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۰۵/۶۔ ۱۰۴) یعنی تم کو جو مدد ملتی ہے یا جو رزق ملتا ہے وہ صرف تمہارے کمزوروں کی وجہ سے ملتا ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر گھر میں اور ہر سماج میں ایسے افراد ہوتے ہیں جو بظاہر کمزور ہوتے ہیں، ترقیاتی سرگرمیوں میں بظاہر ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ایسے افراد عام طور پر گھر میں بھی اور سماج میں بھی حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کو اجتماعی زندگی میں عزت کا مقام نہیں ملتا۔ ایسے لوگ خود بھی مایوسی کا شکار رہتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی ان کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک بوجھ سمجھ لیتے ہیں نہ کہ اپنے حق میں کوئی مفید اثاثہ۔

ایسے حالات میں مذکورہ اسلامی تعلیم ایک عظیم سماجی نعمت ہے۔ یہ تعلیم بتاتی ہے کہ خدائی منصوبے کے مطابق، سماج کی ترقیاتی سرگرمیوں میں ان کمزوروں کا بھی ایک عظیم حصہ ہے۔ کسی سماج میں ان کا وجود خدا کی رحمتوں کو اس کی طرف مائل کرنے کا سبب بنتا ہے۔ بظاہر نہ کرنے کے

باوجود وہ سماج میں بہت بڑی خدمت انجام دیتے ہیں۔

یہ سادہ طور پر صرف ایک اخلاقی تعلیم نہیں، یہ فطرت کا اٹل قانون ہے، یہ خداوند عالم کا تخلیقی منصوبہ ہے۔ اس حقیقت کا شعور جب کسی سماج کے افراد میں پیدا ہو جائے تو ایسا سماج اپنے کمزوروں کے بارے میں آخری حد تک مہربان ہو جائے گا۔ وہ اپنے کمزوروں کو اپنے معاملات میں برابر کا حصہ دار سمجھے گا نہ کہ محض ایک بے فائدہ بوجھ۔

مشکل میں آسانی

قرآن کی سورہ نمبر ۹۴ میں بتایا گیا ہے کہ ـــــ پس مشکل کے بعد آسانی ہے۔۔۔ بے شک مشکل کے بعد آسانی ہے (الانشراح ۵۔۶) ان الفاظ میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے جس کو خدا نے ابدی طور پر پوری دنیا میں قائم کر رکھا ہے۔ آدمی خواہ کسی بھی ملک میں ہو، خواہ وہ کسی بھی زمانے میں ہو، خواہ وہ کسی بھی حالت میں ہو، ہر جگہ اور ہر حال میں وہ فطرت کے اس قانون کو کارفرما پائے گا۔

موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں کسی بھی شخص کے لئے ہمیشہ یکساں حالات نہیں ہوتے۔ مگر قرآن میں بیان کردہ مذکورہ فطری قانون بتاتا ہے کہ کسی بھی حال میں انسان کو بددل یا پست ہمت نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ خود خالق عالم کے قائم کردہ اصول کی بنا پر ہر ناموافق صورت حال میں ایک موافق امکان چھپا ہوا ہے۔

مثلاً ایک شخص کا باپ اس کی کم عمری میں انتقال کر جائے تو یہ بظاہر اس کے لئے ایک ناموافق بات ہے۔ مگر اس حادثے کا موافق پہلو یہ ہے کہ باپ کے سائے سے محرومی اس کے اندر خود اعتمادی کی صفت جگانے والی ثابت ہو گی۔ ایک شخص غریب گھر میں پیدا ہو تو بظاہر یہ محرومی کی بات ہے مگر اس کا روشن پہلو یہ ہے کہ ایسا آدمی اپنے حالات کی بنا پر زیادہ محنت کرے گا اور زیادہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا، وغیرہ۔

اسی طرح ہر مشکل، ہر محرومی اور ہر حادثے میں ہمیشہ ایک نیا اور بہتر امکان چھپا ہوتا

ہے۔ ناموافق حالات چیلنج بن کر آدمی کو جھنجھوڑتے ہیں۔ وہ اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہیں۔ اس طرح ہر ناموافق جھٹکا آدمی کے لئے ترقی کا زینہ بنتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ معمولی انسان سے اوپر اٹھ کر غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔

خوبی تلاش کرو

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یفرك مومن مومنة ان کرہ منھا خلقا رضی منھا آخر (مسند الامام احمد بن حنبل ۲/۳۲۹) یعنی کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے بغض نہ رکھے، اگر اس کے اندر کوئی ناپسندیدہ خصلت ہوگی تو اسی کے ساتھ اس کے اندر کوئی پسندیدہ خصلت بھی موجود ہوگی۔ اس حدیث میں مومن اور مومنہ سے مراد مومن شوہر اور مومن بیوی ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا تخلیقی نظام ہے کہ کسی ایک مرد اور عورت کو تمام انسانی خوبی نہیں دی جاتی۔ ایک مرد اگر جسمانی حیثیت سے زیادہ طاقت ور ہو تو وہ دماغی صلاحیت کے اعتبار سے کم ہوگا اسی طرح اگر کوئی مرد دماغ کے اعتبار سے غیر معمولی صلاحیت کا حامل ہو تو وہ جسم کے اعتبار سے ایک کمزور انسان ہوگا۔ اسی طرح ایک عورت کو اگر صورت کے اعتبار سے زیادہ حصہ ملا ہو تو سیرت کے اعتبار سے وہ زیادہ خصوصیات کی حامل نہ ہوگی۔ اور اگر وہ سیرت میں ممتاز ہو تو صورت کے اعتبار سے وہ کوئی ممتاز خاتون نہ ہوگی۔ اس میں استثناء ہو سکتا ہے مگر عام اصول یہی ہے۔ فطرت کا یہی اصول ہے جس کی طرف مذکورہ حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ ایک ایسا اصول ہے جس میں ہر شادی شدہ جوڑے کے لئے کامیابی کا راز موجود ہے۔ شادی شدہ زندگی کی ناکامی کا سبب اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک دوسرے کو بظاہر اپنی مرضی کے مطابق نہیں پاتا اس لئے وہ اس سے بددل ہو جاتا ہے۔ مگر مذکورہ اصول کے مطابق، اس بددلی کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ فریق ثانی فی الواقع ویسا ہی ہے جیسا کہ فریق اول اس کو سمجھ رہا ہے۔ اس طرح کے معاملے میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ فریق اول کی رائے

یک طرفہ ہوتی ہے۔ وہ فریق ثانی کی شخصیت کے ایک پہلو کو دیکھ کر اس سے بیزار ہو جاتا ہے حالانکہ اگر وہ فریق ثانی کے دوسرے پہلو کو دیکھے تو اس کے بارے میں اس کی رائے بالکل بدل جائے۔

مثال کے طور پر ایک شوہر اپنی بیوی کو ظاہری خصوصیات میں کم پاتا ہے اور اس بنا پر وہ اس کو ناپسند کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کو جاننا چاہئے کہ یہی اس کی بیوی کی کل شخصیت نہیں، عین ممکن ہے کہ ظاہری کمی کے باوجود اس کی شخصیت میں اندرونی اخلاقی صفات بہت زیادہ موجود ہوں۔ اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ کسی خاتون کے اندر سیرت و کردار کے اعلیٰ اوصاف ہونا خاندانی زندگی کے لئے زیادہ اہم حیثیت رکھتا ہے۔

فطرت کا نظام

قرآن کی سورہ نمبر ۹۰ میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان ہوا ہے کہ :**لقد خلقنا الانسان فی کبد** (ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے) اسی طرح قرآن میں دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کے بارے میں پیشگی طور پر یہ بتادیا تھا کہ دنیا میں تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔ **بعضکم لبعض عدو** (البقرہ ۳۶)

قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تکلیف (suffering) موجودہ دنیا کا ایک لازمی حصہ ہے۔ یہ خود خالق فطرت کا مقرر کیا ہوا نظام ہے۔ اس لئے اس کو ختم کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ یہ انسانیت کے نام قرآن کا ایک عظیم فکری تحفہ ہے۔ انسان اگر اس راز کو نہ جانے تو وہ غیر حقیقت پسند بنا رہے گا، وہ غیر ضروری طور پر ہمیشہ یہ کوشش کرے گا کہ وہ اپنے لئے ایک بے مشقت دنیا یا خرابیوں سے پاک سماج (evil-free society) بنا سکے۔ مگر ساری کوشش کے باوجود وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہوگا۔ کیوں کہ فطرت کے قانون کے مطابق ایسا ہونا ممکن نہیں۔ مگر جب وہ اس حقیقت کو جان لے گا تو وہ مسائل کے ساتھ جینے کی کوشش کرے گا اور پھر وہ اسی طرح اپنی پسند کی ایک دنیا بنالے گا جس طرح ایک درخت کانٹوں کے باوجود پھولوں اور پتیوں کے

ذریعہ اپنی ایک پرکشش دنیا بنالیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے مسائل انسان کے لئے مصیبت نہیں۔ وہ انسان کے لئے ترقی کا زینہ ہیں۔ یہ مسائل انسان کو بیدار کرتے ہیں۔ وہ اس کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو حرکت میں لاتے ہیں۔ وہ اس کے جمود کو توڑ کر اس کو مسلسل طور پر زندہ رکھنے کی ضمانت ہیں۔

مسائل زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ مزید یہ کہ وہ ایک مفید حصہ ہیں نہ کہ کوئی مضر حصہ۔ جو لوگ اس حقیقت کو جان لیں وہ بے فائدہ چیزوں میں اپنی طاقت کو ضائع نہیں کریں گے۔ وہ ۔ ندگی کی اعلیٰ تعمیر میں یقینی طور پر کامیاب رہیں گے۔

اقلیت کے لئے خوشخبری

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: كم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله والله مع الصابرين (البقرة ٢٤٩)۔ یعنی کتنے ہی چھوٹے گروہ ہیں جو بڑے گروہ پر غالب آئے ہیں، اللہ کے اذن سے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن کی اس آیت میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے، اس قانون کے مطابق اس دنیا میں عددی اکثریت والا گروہ اگر بظاہر برتر دکھائی دیتا ہے تو عددی اقلیت والا گروہ امکانی طور پر اس سے بھی زیادہ برتر حیثیت رکھتا ہے۔ اس دنیا میں فطرت کا قانون اکثریت سے زیادہ اقلیت کے حق میں ہے۔ اس آیت میں اقلیتی گروہ کے لئے یہ خوشخبری ہے کہ اس کو اپنی عددی کمی کی بنا پر ناامیدی اور پست ہمتی کا شکار نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کو چاہئے کہ وہ اذن اللہ (قانون فطرت) پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے اندر پرامید سوچ پیدا کرے۔ یقینی ہے کہ کامیابی آخر کار اسی کو حاصل ہو گی۔

اقلیتی گروہ کس طرح اکثریتی گروہ پر غالب آسکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جس سماج میں ایسا ہوتا ہے وہاں اکثریتی گروہ اقلیتی گروہ کے خلاف ایک مسلسل چیلنج بن جاتا ہے۔ اکثریتی گروہ زندگی کے ہر میدان میں اقلیتی گروہ کو للکارنے لگتا ہے کہ اگر تم کو جینا ہے تو ہوشیار ہو جاؤ،

تمہاری غفلت تم کو موت کے کنارے پہنچادے گی۔ اکثریت کی طرف سے یہ چیلنج اقلیت کے لئے ایک زبردست تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ وہ چوکنا ہو کر زیادہ مستعدی اور زیادہ ہوشمندی کے ساتھ اپنا عمل کرنے لگتا ہے۔ اکثریتی گروہ کا چیلنج اقلیتی گروہ کے افراد کی فطری صلاحیتوں کو آخری حد تک جگادیتا ہے۔

آیت میں اذن اللہ کا مطلب یہی ہے۔ جہاں بھی اکثریت اور اقلیت کا فرق پایا جائے وہاں خود بخود اذن اللہ کا یہ عمل جاری ہو جائے گا اور آخر کار اس کا وہی نتیجہ نکلے گا جس کی نشاندہی قرآن کی مذکورہ آیت میں کی گئی ہے۔

محبت فاتح عالم

قرآن کی سورۃ الانعام (۹۰-۸۵) میں ایک ساتھ تقریباً ۲۰ پیغمبروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں حضرت عیسیٰ ابن مریم بھی شامل ہیں۔ پیغمبروں کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں یہ آیت ہے کہ ــــ **اولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده** (الانعام ۹۰) یہ وہ پیغمبر ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی تو تم بھی ان کی ہدایت کی اتباع کرو۔

اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے انبیاء بھی امت محمدی کے لئے قابل اتباع ہیں۔ یہ بات قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی کہی گئی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کی سورۃ نمبر ۴۲ میں ارشاد ہوا ہے ــــ اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ تم لوگ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں الگ الگ نہ ہو جاؤ (الشوریٰ ۱۳)

معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے پہلے خدا کے جو پیغمبر آئے، ان کے ثابت شدہ طریقے امت محمدی کے لئے بھی اسی طرح نمونہ ہیں جس طرح وہ خود ان پیغمبروں کی اپنی امت کے لئے نمونہ تھے۔ دیگر انبیاء کا قابل اتباع ہونا قرآن وحدیث دونوں سے ثابت ہے۔ اور علماء اسلام نے اس کو ایک اصول دین کے طور پر تسلیم کیا ہے (ملاحظہ ہو، **الجامع لاحکام القرآن للقرطبی**، ۳۵/۷)

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں پچھلے انبیاء کے حالات کافی تفصیل سے آئے ہیں۔ یہ حالات محض ایک داستان کے طور پر نہیں ہیں بلکہ وہ نمونہ کے طور پر ہیں۔ چنانچہ جس طرح پیغمبر اسلام ﷺ کے اتباع کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں اسوۃ کا لفظ آیا ہے (الاحزاب ۲۱) اسی طرح قرآن میں حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کو بھی اہل اسلام کے لئے اسوۃ

(نمونہ) قرار دیا گیا ہے۔ (الممتحنہ ۴۔۶)

قرآن کا یہ اصول عملی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ اس لئے کہ انسان کی زندگی بے حد وسیع اور متنوع ہے۔ فرد اور جماعت دونوں کے حالات ہمیشہ بہت زیادہ مختلف ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر ہر پیغمبر اور ان کے متبعین کے یہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں جو بعد کے لوگوں کے لئے نمونہ بن سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں پچھلے نبیوں کے مستند حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں تاکہ بعد کے زمانہ کے خدا پرست لوگ ان سے اپنے حالات میں رہنمائی لے سکیں۔ قرآن میں اگر پچھلے پیغمبروں کے یہ واقعات نہ بتائے جاتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ قدیم زمانہ کے انبیاء اور ان کے پیروؤں کے دینی تجربات ہمیشہ کے لئے غیر معلوم رہتے۔ اور ان سے فائدہ اٹھانا بعد کے اہل ایمان کے لئے ممکن نہ ہوتا۔

حضرت یوسفؑ کی مثال

عملی حالات کا تعلق مختلف اسباب سے ہوتا ہے۔ ہر قسم کے حالات کسی ایک پیغمبر پر نہیں گزرتے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی پیغمبر کی زندگی میں ہر قسم کے حالات کے لئے نمونہ موجود ہو۔ اس سلسلہ میں یہاں ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں حکومت کا ایک نیا نظام رائج ہوا ہے جو پچھلے زمانوں میں موجود نہ تھا۔ اس نظام کو ڈیموکریسی کہا جاتا ہے۔ ڈیموکریسی کا نظام قدیم زمانہ کی بادشاہت سے بالکل مختلف ہے۔ قدیم بادشاہت میں صرف ایک شخص کو مطلق حاکم کا درجہ حاصل ہوتا تھا۔ لیکن موجودہ ڈیموکریسی پورے سماج کے مشترک اقتدار کے اصول پر مبنی ہے۔ ڈیموکریسی کے نظام کو ایک لفظ میں اشتراک اقتدار کا نظام (power-sharing system) کہا جا سکتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں دنیا کے بہت سے ملکوں میں ڈیموکریسی کا نظام رائج ہے۔ ان ملکوں میں مسلمان بھی ایک اقلیتی گروہ کے طور پر رہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان ملکوں کے مسلمان کیا کریں۔ اگر وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں اس نوعیت کا کوئی نمونہ تلاش کریں تو یہاں ان کو اس

کا کوئی عملی نمونہ نہیں ملے گا جس سے وہ اس معاملہ میں واضح سیاسی رہنمائی حاصل کر سکیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں عملی طور پر دو حالتوں کے نمونے ملتے ہیں۔ ایک مکی دور کا نمونہ، جہاں آپ صرف داعی کی حیثیت میں کام کرتے رہے اور دوسرا مدنی دور کا نمونہ، جہاں آپ کو حاکم کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ سیاسی اقتدار میں اشتراک کے لئے کوئی واضح نمونہ نہ آپ کے مکی دور میں ہے اور نہ آپ کے مدنی دور میں۔

قرآن کے مذکورہ حکم (الانعام) کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس معاملہ میں ہم کو ایک واضح رہنمائی مل جائے گی۔ یہ رہنمائی حضرت یوسفؑ کی زندگی میں ہے۔ حضرت یوسفؑ ثابت شدہ طور پر خدا کے ایک پیغمبر تھے۔ مصر میں آپ کے ساتھ کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ وہاں کے ہم عصر غیر مسلم حکمراں اپوفیس(Apophis) نے آپ کو ایک بڑے سرکاری عہدہ کی پیش کش کی۔

یہ عہدہ بظاہر وزارت زراعت کا عہدہ تھا۔ مگر یہ تقریباً چار ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ اس زمانہ کی اقتصادیات کا انحصار زیادہ تر زراعت پر تھا۔ زندگی کے تمام معاملات براہ راست یا بالواسطہ طور پر زراعت سے جڑے ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اس زمانہ کے وزیر زراعت کی حیثیت عملی طور پر تقریباً وہی تھی جو موجودہ زمانہ میں وزیر اعظم کی ہوتی ہے۔ چنانچہ جب مذکورہ مصری بادشاہ نے حضرت یوسف کو اس عہدہ کی پیش کش کی تو بائبل کی روایت کے مطابق اس نے حضرت یوسف سے کہا "سو تو میرے گھر کا مختار ہو گا اور میری ساری رعایا تیرے حکموں پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا" (پیدائش باب ۴۱)

ڈھانچہ کے فرق کے ساتھ، یہ صورت عملی طور پر تقریباً وہی تھی جس کو ہم نے اشتراکِ اقتدار (power-sharing) کا نام دیا ہے۔ قرآن اور بائبل کے مطابق، حضرت یوسف نے بادشاہ کی پیش کش کو منظور کر لیا۔ بادشاہ کو قانونی صدر مملکت مانتے ہوئے وہ اس کی حکومت میں

شامل ہو گئے۔ اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار میں شرکت کا اصول ایک ایسا اصول ہے جس کی اصولی تصدیق پیغمبر کے اسوہ سے ہوتی ہے۔

اس نظیر کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ زمانہ کی ڈیموکریسی کے نظام میں شرکت اصولی طور پر بالکل جائز ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اسلام کے خلاف نہیں۔ اگر مسلمان کسی ملک میں ڈیموکریسی کے حالات پائیں تو انہیں اپنی اسلامی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں شرکت کرنی چاہئے۔ ایسے نظام میں ان کی شرکت پیغمبرانہ اسوہ کے مطابق ہوگی نہ کہ اس کے خلاف۔

سیاست کا معاملہ ایک اجتماعی اور سماجی معاملہ ہے۔ ایسے معاملہ میں بعض اوقات قابل عمل صورت صرف یہ ہوتی ہے کہ سماج کے مختلف عناصر کی مجموعی رعایت کی جائے۔ ڈیموکریسی اسی قسم کا ایک عملی نظام ہے اور حضرت یوسفؑ کا نمونہ یہ بتاتا ہے کہ مسلمان اگر حالات کے اعتبار سے ایسے نظام میں شرکت کریں تو ان کا ایسا کرنا شرعی طور پر جائز ہوگا۔

حضرت مسیحؑ کی مثال

اسی طرح قرآن میں حضرت مسیحؑ اور ان کے پیروؤں کا ذکر بار بار آیا ہے۔ قرآن کے اس حصہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی زندگی میں ایک خصوصی اہم مثال ملتی ہے۔ اس مثال کا تعلق تحریک سے ہے۔ اسلامی تحریک یا خدا پرستانہ دعوت کو کس طرح چلایا جائے اور مخالف عناصر سے کس طرح مقابلہ کیا جائے، اس کا ایک خاص نمونہ حضرت مسیح اور ان کے پیروؤں کے یہاں ملتا ہے۔

قرآن کی سورۃ ۶۱ میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ —— اے ایمان لانے والو، تم اللہ کے مددگار بنو، جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون اللہ کے راستہ میں میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں

کے مقابلہ میں تائید کی۔ پس وہ غالب ہو گئے۔ (الصف ۱۴)

قرآن کی اس آیت میں فایدنا الذین آمنوا علی عدوھم کے الفاظ بہت زیادہ قابل غور ہیں۔ ان کے جو ترجمے کئے گئے ہیں، ان میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

پس قوت دادیم مومناں را بر دشمنان ایشاں۔ پس شوند غالب (شاہ ولی اللہ دہلوی)

پھر زور دیا ہم نے ان کو جو یقین لائے تھے ان کے دشمنوں پر۔ پھر ہو رہے غالب (شاہ عبدالقادر)

پھر قوت دی ہم نے ان کو جو ایمان لائے تھے پھر ہو رہے غالب۔ (شیخ الہند)

اس آیت میں قوت (strength) سے کیا مراد ہے۔ اور دشمنوں پر غلبہ پانے کا مطلب کیا ہے۔ یہ نہایت اہم سوال ہے۔ مسیحیت کو اپنے ابتدائی زمانہ میں فلسطین کے یہودیوں کی طرف سے سخت قسم کی دشمنی کا سابقہ پیش آیا۔ حتی کہ وہ حضرت مسیح کے قتل کے درپے ہو گئے۔ تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ حضرت مسیح کے پیروؤں نے ان کے مقابلے میں جنگی ہتھیار استعمال کئے ہوں اور اس کے ذریعہ انہوں نے اپنے دشمنوں پر فتح حاصل کی ہو۔ ایسی حالت میں آخر وہ کون سی قوت تھی جو ان کے لئے اپنے دشمنوں کے اوپر فتح و غلبہ کا ذریعہ بنی۔

اس کا جواب قرآن میں یہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیروان مسیح کے اندر خصوصی طور پر ایک اخلاقی اور روحانی صفت پیدا کر دی جو مادی ہتھیار کے بغیر جنگ جیتنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ قرآن میں حضرت مسیح اور ان کے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: وجعلنا فی قلوب الذین اتبعوہ رافۃ ورحمۃ (الحدید ۲۷)۔ یعنی جن لوگوں نے مسیح کی پیروی کی ان کے دلوں میں ہم نے شفقت اور رحمت رکھ دی۔

اس آیت میں متبعین مسیح کے لئے جس رأفت و رحمت کا ذکر ہے وہ بعد از اتباع کا واقعہ ہے نہ کہ قبل از اتباع کا واقعہ۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ پہلے ہی سے رأفت و رحمت کے جذبات لے کر پیدا ہوئے تھے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیح کے ذریعہ

ان کو جو دین سکھایا گیا تھا اس نے ان کے اندر یہ جذبہ پیدا کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ فلسطین میں جب ان کو یہودیوں کی دشمنانہ کارروائیوں کا سامنا پیش آیا تو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کو ٹکراؤ کے بجائے یہ تعلیم دی گئی کہ رأفت ورحمت سے اس کا مقابلہ کرو۔ یہی بات خود انجیل سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ (لوقا باب ٦)

اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کے پیروؤں کو جو طاقت دی گئی وہ رأفت ورحمت کی طاقت تھی۔ اسی پرامن ہتھیار کے ذریعہ وہ اپنے دشمنوں پر اس طرح غالب ہوئے کہ جو لوگ پہلے ان کے غیر یا دشمن بنے ہوئے تھے۔ وہ دوست بن کر ان کی صف میں شامل ہو گئے۔ اس طرح ان کی عددی قوت اتنی بڑھ گئی کہ خود یہی عددی برتری ان کے غلبہ کا ذریعہ بن گئی۔

اس سلسلہ میں حضرت مسیح نے اپنے پیروؤں کو جو تعلیم دی تھی وہ موجودہ انجیل میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ اگرچہ اصل مسیحی تعلیم کا صرف ترجمہ ہے تاہم اس میں حضرت مسیح کی تعلیم کی روح اب بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے بعض حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔ جو تم سے عداوت رکھیں ان کا بھلا کرو۔ جو تم پر لعنت کریں ان کے لئے برکت چاہو۔ جو تمہاری تحقیر کریں ان کے لئے دعا کرو۔ جو تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور جو تمہارا چغہ لے اس کو کرتہ لینے سے بھی منع نہ کر۔ (لوقا باب ٦)

یہودی فریسیوں نے یسوع سے پوچھا کہ کیا قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں۔ یسوع نے جواب دیا کہ جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو (متی باب ۲۲)

جیسا کہ معلوم ہے، حضرت مسیح اور ان کے متبعین کو فلسطین میں اول دن سے سخت مخالفت اور دشمنی کا سامنا پیش آیا۔ ان کے یہ دشمن یہودی لوگ تھے جو اس وقت اس علاقہ میں طاقتور حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی اس دشمنانہ کارروائیوں میں وہاں کے رومی حکمرانوں

کو بھی اپنا ہمنوا بنالیا۔ اس کے نتیجہ میں حضرت مسیح اور ان کے ماننے والوں کے لئے وہاں انتہائی حد تک غیر موافق ماحول پیدا ہو گیا۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ حضرت مسیح کے متبعین نفرت اور تشدد اور ٹکراؤ کے راستہ پر چل پڑیں۔ وہ شہادت کی جذباتی تقریریں کر کے مسیحیوں کو لڑنے مرنے پر آمادہ کریں۔ مگر اس سخت ترین ماحول میں بھی حضرت مسیح نے ان کو محبت کا پیغام دیا۔ انھوں نے کہا کہ تم اپنے دشمنوں سے نفرت نہ کرو بلکہ ان سے محبت والا معاملہ کرو۔

"دشمن سے محبت کرو" کی بات کوئی سادہ بات نہ تھی بلکہ یہ ایک مکمل طرز فکر اور ایک مکمل پروگرام تھا۔ اس کا مطلب، ایک لفظ میں یہ تھا کہ حضرت مسیح نے اپنے پیروؤں کو نفرت پر مبنی عمل (hate-based activism) سے روکا اور انہیں محبت پر مبنی عمل (love-based activism) کے راستہ پر ڈال دیا۔

"دشمن سے محبت کرو" کا مطلب ہے کہ تم دشمن کے خیر خواہ بنو۔ دعوت کی بنیاد یہی خیر خواہی ہے۔ دعوت دراصل محبت انسانی کا اظہار ہے۔ حضرت مسیح نے جب دشمن سے محبت کرنے پر زور دیا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ تم لوگ تمام انسانوں سے دعوتی خیر خواہی کرو، حتی کہ اپنے دشمنوں سے بھی۔ تم ہر آدمی کی ہدایت کے حریص بنو، خواہ وہ تمہارا موافق ہو یا مخالف، خواہ وہ تم سے دور ہو یا تم سے قریب۔ تم ہر ایک کو خدا کی رحمت میں داخل کرنے کے لئے سرگرم ہو جاؤ۔

حضرت مسیح کا یہ کہنا کہ "جو قیصر کا ہے قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے خدا کو دو" کوئی انفعالی تعلیم نہ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وقت کے حکمرانوں سے پولیٹکل ٹکراؤ کرنے سے بچو تاکہ ایسا نہ ہو کہ تمہارا سارا وقت منفی ٹکراؤ میں گزر جائے۔ اور غیر سیاسی میدان میں مثبت جدو جہد کے جو امکانات ہیں وہ غیر استعمال شدہ رہ جائیں۔ اسی طرح حضرت مسیح کا یہ کہنا کہ "جو تمہارا کرتا مانگے اس کو اپنا چغہ بھی دے دو" یہ بھی کوئی بزدلی اور سپردگی کی تعلیم نہ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی سے کوئی

نزاع پیدا ہو تو جلد از جلد اس کو ختم کردو، خواہ وہ یکطرفہ ایڈ جسٹمنٹ (unilateral adjustment) کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس پالیسی کو چند لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ مسائل سے اعراض کرو اور مواقع کو استعمال کرو:

Ignore the problems, avail the opportunities.

اس پالیسی کے تحت حضرت مسیح نے اپنے ساتھیوں کو دعوتی ہجرت کا مشورہ دیا۔ یعنی وہ لوگ فلسطین سے نکل کر اطراف کے علاقوں میں چلے جائیں اور وہاں پر امن طور پر رہ کر لوگوں کی خدمت کریں اور انہیں مسیحیت کا پیغام پہنچائیں۔

اس واقعہ کا ذکر انجیل میں اس طرح آیا ہے: اور مسیح کے گیارہ شاگرد گلیل کے اس پہاڑ پر گئے جو یسوع نے ان کے لئے مقرر کیا تھا... یسوع نے پاس آکر ان سے باتیں کیں... اور کہا کہ تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ... اور ان کو تعلیم دو کہ ان سب باتوں پر عمل کریں جن کا میں نے تم کو حکم دیا (متی باب ۲۸)

یہی بات حدیث میں اس طرح آئی ہے۔ ایک روایت کے مطابق، معاہدہ حدیبیہ سے واپسی کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ ارادہ کیا کہ عرب کے اطراف میں بادشاہوں اور سرداروں کو دعوتی خطوط روانہ کریں۔ اس وقت آپ نے اپنے اصحاب کو مدینہ میں جمع کیا اور کہا کہ اے لوگو، اللہ نے مجھ کو دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ تو تم لوگ میرے ساتھ اختلاف نہ کرو۔ جس طرح حواریوں نے عیسیٰ بن مریم کے ساتھ اختلاف کیا۔ یہ سن کر اصحاب رسول نے کہا کہ اے خدا کے رسول، حواریوں نے کس طرح اختلاف کیا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ عیسیٰ نے حواریوں کو اسی کام کی طرف بلایا تھا جس کام کی طرف میں تم کو بلا رہا ہوں۔ تو جس کو انہوں نے قریب کے مقام پر بھیجنا چاہا وہ اس پر راضی رہے اور جس کو دور کے مقام پر بھیجنا چاہا تو اس کو یہ بات شاق ہوئی اور ناگوار گزری۔ تو عیسیٰ نے اللہ سے اس کی شکایت کی تو جن کو گرانی ہوئی تھی ان کا حال یہ ہوا کہ ان میں سے ہر ایک ان لوگوں کی

زبان بولنے لگا جن کی طرف ان کو بھیجا جا رہا تھا۔ (سیرت ابن ہشام ۲۷۹/۴)

حضرت مسیح کی ہدایت پر آپ کے متبعین کا اس طرح فلسطین سے نکلنا ایک قسم کی داعیانہ ہجرت تھی۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے وطن سے نکل کر اطراف کے ملکوں میں پھیل گئے اور خاموشی کے ساتھ لوگوں کو مسیحیت کا پیغام دینے لگے۔ حضرت مسیح کی ہدایت کے مطابق ان کا طریقہ یہ تھا کہ سیاسی اقتدار سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہ کریں۔ اگر کسی سے نزاع پیدا ہو جائے تو اس کو فوراً ہی یک طرفہ طور پر حل کرلیں۔ وہ لوگوں کے ساتھ محبت اور خیر خواہی کا معاملہ کریں۔ دوسروں کے ساتھ ان کا یہ سلوک گویا دعوت کی فضا بنانے کے ہم معنی تھا۔ اس موافق فضا میں وہ لوگوں کو مسیحیت کا پیغام دینے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحیت تیزی سے لوگوں کے درمیان پھیلنے لگی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ تھوڑی ہی مدت میں مسیحیت مختلف ملکوں میں پھیل گئی۔ مثلاً روم، یونان، شام، مصر، سوڈان، حبش، شمالی افریقہ، جارجیا، آرمینیا، مالا بار کوسٹ وغیرہ۔ حضرت مسیح کے بعد ابتدائی پانچ صدیوں میں مسیحیت جس طرح دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی اس کی تفصیل درج ذیل کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے:

Harnack : Mission and Expansion of Christianity in the First Three Centuries (1902)

Kenneth Scott Latourette : History of the Expansion of Christianity (1945)

دوہزار سال پہلے حضرت مسیح کی وفات کے بعد مسیحیت برابر پھیلتی رہی۔ حضرت مسیح کی تعلیم کے مطابق، مسیح کے پیروؤں کے سامنے صرف دو نکاتی پروگرام تھا —— محبت اور دعوت۔ یک طرفہ محبت اور پر امن دعوت کے اسی اصول کو لے کر وہ پھیلتے رہے یہاں تک کہ وہ یورپ تک پہنچ گئے۔ اس وقت یورپ کے بیشتر حصہ میں رومن امپائر کا سیاسی اقتدار قائم تھا۔ ابتداءً ان کو رومن امپائر کی طرف سے سخت اذیت (persecution) کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر وہ انتقام یا ٹکراؤ سے

دور رہتے ہوئے اپنا مشنری کام پرامن طور پر کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۳۷ء میں خود رومی حکمراں کانسٹنٹین اول (Constantine I) نے مسیحیت کو قبول کرلیا۔ یہ الناس علی دین ملوکھم کا زمانہ تھا۔ چنانچہ تھوڑی مدت میں یورپ کی بیشتر آبادی نے مسیحیت کو قبول کرلیا۔

رومی بادشاہ نے ۳۳۷ء میں مسیحیت کو قبول کیا تھا اور اس کے بعد ۶۱۰ء میں پیغمبر اسلام محمد ﷺ کو خدا کی طرف سے نبوت ملی۔ اس طرح رومی بادشاہ کی قبولیت مسیحیت کا واقعہ نبوت محمدی سے تقریباً ۲۷۵ سال پہلے پیش آیا۔

اسلام کی تعلیم

پیغمر اسلام ﷺ کی تعلیم بھی وہی ہے جو دوسرے پیغمبروں اور حضرت مسیح کی تعلیم تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب پیغمبر اسلام نے اپنے اصحاب کو عرب کے باہر مختلف ملکوں میں بھیجا تاکہ وہ حاکموں اور سرداروں کو اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ اس وقت آپ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے جو کچھ کہا تھا اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں کو اسی چیز کی دعوت دی تھی جس کی دعوت میں تم کو دے رہا ہوں (دعا ھم الی الذی دعوتکم الیہ) سیرت ابن ہشام الجزء الرابع، صفحہ ۲۷۸

قرآن (الانبیاء ۱۰۷) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام ﷺ کو دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے (وما ارسلناك الا رحمة للعالمین) اسی طرح قرآن (آل عمران ۱۵۹) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام کے دل میں خصوصی طور پر سختی کے بجائے نرمی کا مادہ رکھ دیا (فبما رحمة من اللہ لنت لھم) ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ اے لوگو تم لوگ دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو، بلکہ اللہ سے عافیت مانگو (ایھا الناس لا تتمنوا لقاء العدو وأسألوا اللہ العافیة) ریاض الصالحین ۳۲۸

اسلامی طریق عمل کو اگر ایک نام دینا ہو تو اس کو پرامن عمل (peaceful activism) کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے کہ : الصلح خیر (النساء ۱۲۸) یعنی نزاع کے وقت ٹکراؤ

کے بجائے صلح کا طریقہ زیادہ بہتر ہے۔ ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: ان الله رفیق ، یحب الرفق، ویعطی علیه ما لا یعطی علی العنف (سنن ابی داؤد، الجزء الرابع، صفحہ ۲۵۵)۔ یعنی اللہ نرم ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے۔ اور وہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔

قرآن میں ایک مقام پر فطرت کا ایک اصول اس طرح بیان کیا گیا ہے: اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیبے والا ہے۔ (حم السجدہ ۳۴۔۳۲)

اس آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر حق کی طلب فطری طور پر رکھ دی ہے۔ کوئی شخص یا کوئی گروہ اگر حق کے داعیوں کا دشمن بن جائے تو یہ اس کی مصنوعی حالت ہوگی نہ کہ اس کی حقیقی حالت۔ امکانی طور پر وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح حق کا طالب ہوگا اگرچہ بظاہر یہ دکھائی دے رہا ہوگا کہ وہ حق کا دشمن ہے۔ ایسی حالت میں حق کے داعیوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی مخالفانہ روش کو نظر انداز کر کے ان سے اعتدال کے ساتھ معاملہ کریں، وہ محبت اور خیر خواہی کے ساتھ ان کو حق کا پیغام پہنچاتے رہیں۔ اس کے بعد یقینی ہے کہ وہ حق کو قبول کر لیں گے۔ ایسے لوگوں کے لئے اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے ظاہری عناد کا پردہ ہٹا دیا جائے۔ اور پردہ ہٹانے کا یہ کام صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ جوابی عناد کا معاملہ نہ کیا جائے بلکہ یک طرفہ محبت اور خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے۔

پیغمبروں کا طریقہ دشمن کو دوست بنانا ہے نہ کہ دشمن کو دشمن قرار دے کر اس سے کٹ جانا۔ یہی ہمیشہ ہر پیغمبر کی تعلیم رہی ہے۔ اور خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم بھی یہی ہے۔ مزید یہ کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس معاملہ کی صرف اصولی تعلیم نہیں دی بلکہ آپ کی

پوری زندگی اس بات کی عملی مثال بن گئی کہ اچھا سلوک کس طرح مخالفین کو بدل دیتا ہے اور دشمنوں کو اپنا دوست بنالیتا ہے۔

خلاصۂ کلام

حضرت مسیح کا ایک قول انجیل میں اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ: یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں۔ بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں (متی باب ۱۰) اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: **امرت ان اقاتل الناس** (صحیح البخاری کتاب الایمان) مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی قول مطلق معنوں میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ مقید معنوں میں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے تمام اقوال یا احکام صرف وقتی صورت حال کے اعتبار سے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ صورت حال جب کہ فریق ثانی کی یک طرفہ جارحیت کی بنا پر دفاع کی ناگزیر ضرورت پیش آگئی ہو۔ جہاں تک اصل پیغمبرانہ مشن کا تعلق ہے وہ ہر پیغمبر کے یہاں ایک ہی رہا ہے، اور وہ ہے نصح (خیر خواہی) اور امن کے ساتھ لوگوں کو خدا کی طرف بلانا۔ پیغمبرانہ مشن ہر حال میں اسی اصول پر جاری رہتا ہے، وہ کسی بھی حال میں اپنی طرف سے تشدد کا طریقہ اختیار نہیں کرتا۔ حتی کہ اگر فریق ثانی تشدد اور جارحیت پر آمادہ ہو جائے تب بھی پیغمبرانہ طریق کار کا تقاضہ ہے کہ اعراض کے ذریعہ آخر وقت تک اس سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

پیغمبر کا اصل کام انسان کو ہدایت دے کر اس کو صالح زندگی گزارنے کا موقع دینا ہے نہ کہ اس کو قتل کر کے اس کا خاتمہ کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کے مشن میں امن کی حیثیت اصول عام کی ہے اور جنگ کی حیثیت صرف استثناء کی۔

باب سوم

کوئی آدمی زلزلہ سے لڑ نہیں سکتا۔ اسی طرح کوئی آدمی فطرت کے قوانین سے لڑ کر موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کی تعمیر نہیں کر سکتا۔

اتحادِ انسانیت

ایک مغربی فلسفی نے کہا ہے کہ انسانیت کی تاریخ لڑائی جھگڑے کے رجسٹر سے کچھ ہی کم ہے۔ مزید یہ کہ دنیا کی اکثر لڑائیاں مذہب کے نام پر پیش آئیں۔ اس کو دیکھ کر بہت سے مفکرین نے یہ رائے قائم کرلی کہ انسانوں کے درمیان لڑائی جھگڑے کی سب سے بڑی وجہ مذہب ہے۔ کارل مارکس جیسے بہت سے لوگوں نے یہ کہا کہ انسانیت کے درمیان امن قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مذہب کا خاتمہ کردیا جائے۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس قسم کی رائے محض ایک دیوانگی ہے نہ کہ کوئی واقعی رائے۔

دوسری قسم کے مفکرین وہ ہیں جنھوں نے اس مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ مذہب کے نام پر جھگڑے غیر ضروری ہیں۔ کیوں کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ ہر مذہب یکساں طور پر سچا ہے۔ مختلف مذاہب گویا مختلف راستے ہیں جو ایک ہی مشترک منزل کی طرف جاتے ہیں۔ اس نظریہ کو کسی نے تعدد کے درمیان وحدت (unity in diversity) سے تعبیر کیا۔ اور کسی نے اس کو توحدِ حقیقت (oneness of reality) کا نام دیا۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ اگر مذاہب کے بارے میں اس اشتراکی نقطہ نظر کو مان لیا جائے تو اس کے بعد تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے اور انسانی سماج میں مکمل امن قائم ہو جائے گا۔

مگر یہ حل نادرست بھی ہے اور بے فائدہ بھی اور اسی کے ساتھ ناقابل عمل بھی۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اصل مسئلہ مذاہب کے درمیان یکسانیت تلاش کرنے کا نہیں ہے بلکہ حاملین مذاہب یا انسانوں کے درمیان یکسانیت تلاش کرنے کا ہے۔

چند نکات

۱۔ مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک مذہب کے اعتقادات اور دوسرے مذہب کے اعتقادات میں ایسے بنیادی فرق موجود ہیں جو اس دعویٰ کی کھلی تردید کرتے ہیں کہ

تمام مذاہب ایک ہیں۔ خدا، پیغمبر، الہام، زندگی اور موت، ہر ایک کے بارے میں مختلف مذاہب میں الگ الگ تصورات پائے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کہ تمام مذاہب ایک ہیں، ایک ایسی بات ہے جس کو خود مذاہب کبھی تسلیم نہیں کر سکتے۔

۲۔ مذاہب کے درمیان اختلاف ہونا کوئی برائی نہیں بلکہ یہ ایک خوبی کی بات ہے اس دنیا میں ذہنی اور فکری ترقیاں اختلافات کے ذریعہ ہی وجود میں آتی ہیں۔ جب ایک معاملہ میں دو رائیں سامنے آتی ہیں تو فطری طور پر دونوں طرف سے مباحثہ شروع ہو جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان افکار کا ٹکراؤ پیش آتا ہے۔ اس بحث و تکرار کے ذریعہ نئے نظریات سامنے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اصل حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ علم کی پوری تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے کہ اختلاف ہی کے ذریعہ تمام فکری ترقیاں ظہور میں آئیں۔

مثال کے طور پر شمسی نظام کے بارے میں قدیم زمانہ میں دو مختلف نظریے پیش کئے گئے۔ ارسٹارکس نے کہا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ دوسرا نظریہ ٹالمی کا تھا جس نے کہا کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جاتا کہ یہ دونوں ہی نظریے درست ہیں۔ دونوں ایک ہی مشترک حقیقت کا اظہار ہیں۔ تو نظام فلکی کے بارے میں اصل حقیقت واضح ہو کر کبھی سامنے نہ آتی۔ مگر اہل علم کے درمیان دونوں نظریات پر بحثیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار ایک نظریہ کا درست ہونا واضح طور پر سامنے آگیا۔ اختلاف سچائی تک پہنچنے کا زینہ بن گیا۔

علم کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ رایوں کا اختلاف ہمیشہ ذہنی ترقی کا سبب بنتا ہے۔ مذہب کا معاملہ بھی عین یہی ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ تمام مذاہب ایک ہیں تو اس کے بعد مذہب کے دائرے میں بحث اور ڈائیلاگ کا دروازہ بند ہو جائے گا، اور اسی کے ساتھ مذہبی افکار میں ترقی کا دروازہ بھی ہمیشہ کے لئے بند پڑا رہے گا۔ انسان اُس حقیقت کی دریافت سے محروم رہ جائے گا جس کی دریافت کے بغیر انسانیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

۳۔ "تمام مذاہب سچے ہیں" کا نظریہ خود مذہب کی ضد ہے۔ مذہب یقین کا سرچشمہ

ہے۔ کسی انسان کا سب سے بڑا سرمایہ یہ ہے کہ اس کو ایک ایسی سچائی ملی ہوئی ہو جس کے برحق ہونے پر وہ کامل یقین کر سکے، جو اس کے لئے اعتماد و توکل کا آخری سہارا ہو۔ جو اس کو اس احساس سے سرشار رکھے کہ اس نے اس حقیقت کو پالیا ہے جس کی طلب وہ اپنی فطرت کی گہرائیوں میں محسوس کر رہا تھا۔

لیکن جب یہ مان لیا جائے کہ تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان مذہب پر یقین سے محروم ہو جائے گا۔ یقین فطری طور پر وحدت چاہتا ہے نہ کہ تعدد۔ ایسی حالت میں ہر مذہب کو سچا ماننے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بھی مذہب آدمی کے لئے یقین اور اعتماد کا سرچشمہ نہ بن سکے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: ما جعل الله لرجل من قلبين في جوفه (الاحزاب . ٤) اس کا مطلب یہ ہے کہ پیدائشی ساخت کے مطابق کوئی ایک ہی چیز کسی کے لئے کامل معنوں میں مرکز توجہ یا مرکز محبت بن سکتی ہے نہ کہ کئی چیزیں۔ کوئی شخص اگر آپ سے یہ مطالبہ کرے کہ آپ دنیا کی ہر خاتون سے اپنی ماں کی طرح محبت کریں تو یہ ایک غیر فطری اور ناممکن بات ہوگی۔ فطرت کے مطابق صحیح بات یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی ماں سے محبت رکھے اور اس کے علاوہ جو عورتیں ہیں ان کا وہ مکمل احترام کرے۔

ایسی حالت میں صحیح اور فطری بات صرف یہ ہے کہ آدمی جس مذہب میں سچائی دیکھے اس کو وہ اپنے یقین اور اعتماد کا مرکز بنائے۔ اور بقیہ مذاہب سے یکساں طور پر احترام کا معاملہ کرے۔ مہاتما گاندھی اس نظریے کے ایک بڑے حامی تھے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ رام رحیم ایک ہے۔ مگر واقعات ثابت کرتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کو صرف ایک کے اوپر گہرا یقین تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۸ میں جب ان کو گولی ماری گئی تو موت سے پہلے جو لفظ ان کی زبان سے نکلا وہ "ہے رام ہے رحیم" نہیں تھا بلکہ صرف "ہے رام" تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ "تمام مذاہب سچے ہیں" کا نظریہ آدمی کو سچائی تو نہیں دے گا، البتہ وہ

اس کو دو میں سے ایک خرابی میں مبتلا کر دے گا۔ اس کو یا تو کسی بھی مذہب پر گہرا یقین نہ ہو گا، یا وہ ایسا کرے گا کہ حقیقی طور پر تو وہ صرف ایک مذہب کو مان رہا ہو گا، البتہ مصلحت کی خاطر وہ اپنی زبان سے لفظی طور پر یہ کہے گا کہ تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں۔

۴۔ اس معاملہ میں صحیح نظریہ یہ ہے کہ مذاہب میں اختلاف کو مان کر بحث اور ڈائیلاگ کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ البتہ انسان کی سطح پر ہر ایک کو قابل احترام سمجھا جائے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک واقعہ اس اصول کی تائید کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ جب مدینہ میں تھے، ایک روز آپ نے دیکھا کہ قریب کے راستہ سے ایک جنازہ گذر رہا ہے۔ لوگ ایک میت اٹھائے ہوئے اس کو قبرستان کی طرف لے جا رہے تھے۔ اس وقت آپ بیٹھے ہوئے تھے۔ جنازہ کو دیکھ کر آپ اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ آپ کے ایک ساتھی نے کہا کہ اے خدا کے رسول یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا (نہ کہ کسی مسلمان کا جنازہ)۔ آپ نے فرمایا "کیا وہ انسان نہ تھا" (الیست نفساً) فتح الباری بشرح صحیح البخاری، ۳/۲۱۴۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق یہ معلوم ہے کہ آپ یہودی مذہب سے اختلاف رکھتے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے یہودی کو ایک انسان کی حیثیت سے دیکھا اور انسان کی حیثیت سے اس کا احترام کیا۔ یہی اس معاملہ میں صحیح فارمولہ ہے۔ اس کو اختیار کرنے کی صورت میں مذہب کے درمیان مباحثہ اور ڈائیلاگ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جو فکری ارتقاء کی لازمی شرط ہے۔ اور دوسری طرف انسان کی سطح پر تمام افراد کو انسان کے روپ میں دیکھنے کا یہ فائدہ ملتا ہے کہ وہ سماجی اتحاد اور معاشرتی ہم آہنگی پوری طرح باقی رہتی ہے جو بہتر سماجی زندگی کے لئے ضروری ہے۔

۵۔ یہ عقیدہ کہ تمام مذاہب یکساں ہیں، باہمی ٹکراؤ کے خلاف کوئی لازمی چیک نہیں۔ دنیا کی بے شمار لڑائیاں ایک ہی عقیدہ اور مذہب کے ماننے والوں کے درمیان ہوئیں۔ مثلاً قدیم ہندستان میں مہابھارت کی لڑائی، جو دو ہم مذہب گروہوں کے درمیان ہوئی۔ یورپ کی پہلی اور

دوسری عالمی جنگ، جس کے دونوں فریق ایک ہی مذہب کے ماننے والے تھے۔ افغانستان کی موجودہ جنگ، جس میں ایک ہی مذہب کے ماننے والے دوگروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے خلاف خونی جنگ لڑ رہے ہیں، وغیرہ۔ لڑائی کا تعلق کچھ اور اسباب سے ہے نہ کہ مذہب اور عقیدہ کے اختلاف سے۔

۶۔ یہ بے حد سادگی کی بات ہے کہ مختلف مذاہب کو ایک بتا کر یہ سمجھا جائے کہ انسانوں کے درمیان اختلاف ختم ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرق واختلاف خود فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ بالفرض اگر مذہب کا اختلاف ختم کر دیا جائے تب بھی ہزاروں دوسرے اختلافات انسانوں کے درمیان موجود رہیں گے جو ان کو ٹکرانے کے لئے کافی ہوں گے۔ فرق واختلاف جب خود فطرت ہی کا ایک حصہ ہو تو کوئی بھی انسان اس کو ختم کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔

مذہب کے علاوہ زندگی کے جو دوسرے شعبے ہیں، ان میں ہر جگہ لوگوں کے درمیان باہمی اختلافات پائے جاتے ہیں، حتیٰ کہ باپ بیٹے اور میاں بیوی کے درمیان بھی۔ زندگی کا پورا نظام اختلاف کو گوارا کرنے کے اصول پر چل رہا ہے نہ کہ اختلاف کو مٹانے کے اصول پر۔ ایسی حالت میں آسان ترین بات یہ ہے کہ مذہب کے معاملے میں بھی اسی عام اصول کو مان لیا جائے جو دوسرے انسانی شعبوں میں ہمیشہ سے جاری ہے، یعنی اختلاف کے باوجود اتحاد، اختلاف کے باوجود عزت واحترام۔

یہ نظریہ کہ تمام مذاہب یکساں طور پر برحق ہیں، غیر واقعی بھی ہے اور بے فائدہ بھی۔ زیادہ صحیح اور قابلِ عمل بات یہ ہے کہ تمام انسان قابلِ احترام ہیں۔ مختلف مذاہب میں بلاشبہ اختلاف ہے اور اس اختلاف کے بارے میں پرامن ڈائیلاگ بھی جاری رہنا چاہئے۔ مگر جہاں تک حامل مذہب یا دوسرے لفظوں میں انسان کا معاملہ ہے، وہ ہر حال میں عزت واحترام کا مستحق ہے۔ ہر انسان یکساں طور پر خدا کی مخلوق ہے۔ ہر انسان بحیثیت انسان برابر کا درجہ رکھتا ہے۔ یہی واحد فارمولا ہے جو دو مختلف عناصر (مذہب اور حامل مذہب) کے درمیان توازن قائم کر سکتا ہے۔

اور انسانیت کو وہ امن دے سکتا ہے جو بہتر دنیا کی تعمیر کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اتحاد کا صحیح فارمولا یہ نہیں کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس کے بجائے انسانوں کے درمیان اتحاد کی فضا قائم کرنے کا صحیح فارمولا یہ ہے کہ ـــ ایک کی پیروی کرو، اور سب کا احترام کرو :

Follow one and respect all.

وحدت کا راز

۵ اپریل ۱۹۹۸ کو میں رشی کیش میں تھا۔ اس وقت یہاں ایک پروگرام کے تحت مختلف ملکوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو آئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر ایک مجلس میں چند تعلیم یافتہ ہندوؤں سے ایک مفید گفتگو ہوئی۔ اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ انسانی سماج میں باہمی رواداری (tolerance) اور احترام (respect) کا ماحول کس طرح پیدا کیا جائے۔ انھوں نے اس کا حل یہ بتایا کہ لوگوں کے اندر وحدت حقیقت (oneness of reality) کا عقیدہ بٹھایا جائے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ سچائی ایک ہے مگر اس کے راستے مختلف ہیں۔ آدمی جس مذہبی طریقہ پر بھی چلے، آخر کار وہ خدا تک پہنچ جائے گا۔

یہ ایک قدیم نظریہ ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے جو دلیلیں دی جاتی ہیں سب کی سب تمثیل پر مبنی ہیں۔ مثلاً مذکورہ مجلس میں ایک ہندو اسکالر نے کہا کہ اگر آپ ایک پہاڑی کے نیچے کھڑے ہوں تو وہاں آپ کو ایک ہی راستہ دکھائی دے گا جو پہاڑی کے اوپر جارہا ہوگا۔ لیکن اگر آپ پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ جائیں اور اس کے چاروں طرف دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ پہاڑ کے ہر طرف راستے ہیں اور وہ سب الگ الگ ہونے کے باوجود ایک ہی بلندی پر پہنچ رہے ہیں۔

یہ استدلال صرف ایک تمثیل پر مبنی ہے، اور تمثیلی استدلال خالص علمی اعتبار سے کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اس کو نہایت آسانی کے ساتھ دوسری تمثیل سے رد کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً بمبئی یا

دہلی جیسے ریلوے اسٹیشن پر کوئی شخص کھڑا ہو تو اس کو سیکڑوں گاڑیاں چلتی ہوئی نظر آئیں گی۔ مگر یہ سمجھنا یقینی طور پر درست نہ ہوگا کہ ان میں سے ہر گاڑی ایک ہی آخری اسٹیشن کی طرف جارہی ہے۔ مذکورہ تمثیل میں تمام راستے اگر ایک ہی منزل کی طرف جارہے تھے تو اس قسم کی دوسری تمثیل میں ہر راستہ الگ الگ منزل کی طرف چلا جارہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی سماج میں احترام اور رواداری کا ماحول پیدا کرنے کے مسئلہ سے مذکورہ نظریہ کا کوئی تعلق نہیں، حتی کہ اگر تمام لوگ اس عقیدہ کو مان لیں تب بھی وہ مطلوب سماجی مقصد کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ایک مذہب کو ماننے والے گروہ کے درمیان باہمی طور پر ہر زمانہ میں لڑائیاں جاری رہی ہیں اور آج بھی جاری ہیں۔ پھر جو نظریۂ اتحاد ایک مذہب کے درمیان کار آمد نہ ہو سکا، وہ مختلف مذاہب کے درمیان کس طرح کار آمد بن جائے گا۔

"وحدتِ دین سماجی اتحاد پیدا کرتا ہے" ـــــ یہ نظریہ بظاہر یہ فرض کرتا ہے کہ 'وحدت دین' کے اصول کو ابھی تک عمل میں نہیں لایا گیا ہے، اب اس کا عملی تجربہ کرنا ہے۔ حالانکہ یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نہایت اعلیٰ سطح پر اس نظریہ کا تجربہ کیا گیا مگر وہ سراسر ناکام ثابت ہوا۔ شہنشاہ اکبر کی حکومتی طاقت، ڈاکٹر بھگوان داس کا انسائیکلوپیڈیائی علم اور مہاتما گاندھی کی مقبول لیڈر شپ، اس قسم کے بہت سے بڑے بڑے تجربے ناکامی کی اس فہرست میں شامل ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج ہمارے سامنے جو اصل مسئلہ ہے وہ وحدت دین کے نظریہ کے تجربہ کا نہیں ہے بلکہ اس کے لمبے تجربہ کے باوجود مطلوب نتیجہ نہ نکلنے کا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جو چیز مفقود ہے وہ نظریہ کی موجودگی نہیں ہے بلکہ نظریہ کے موجود ہوتے ہوئے نتیجہ کا حاصل نہ ہونا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں اس نظریہ کے سوا ایک اور حل تلاش کرنا ہے نہ کہ اسی ناکام تجربہ کو مزید دہرانا۔

اس مسئلہ کا زیادہ صحیح اور قابل عمل حل وہ ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے جو تصور دیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انسان نفس واحدہ سے پیدا کیے گئے ہیں (النساء ۱) یعنی تمام انسانوں کی اصل ایک ہے۔ تمام انسان ایک ہی جوڑے کی اولاد ہیں۔ اس لحاظ سے تمام انسان آپس میں بہن بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب کے سب آپس میں بلڈ سسٹرز (خونی بہن) اور بلڈ برادرز (خونی بھائی) ہیں۔

اس تصور کے مطابق، سماج میں اتحاد و احترام کا ماحول پیدا کرنے کی بنیاد وحدت انسانیت ہے۔ یعنی یہ کہ تمام لوگ اس حقیقت کو مانیں کہ ظاہری اختلاف کے باوجود سب کے سب اصلاً ایک انسانی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے اعتبارات سے بظاہر مختلف ہونے کے باوجود وہ انسانی اعتبار سے ایک ہیں۔

انسانی سماج میں اتحاد کا راز وحدت ادیان کے عقیدہ میں نہیں ہے بلکہ وحدت انسان کے عقیدہ میں ہے۔ یعنی مذہب تو جدا جدا ہیں مگر انسان سب کے سب یکساں سماجی درجہ رکھتے ہیں۔ سماج میں اتحاد و احترام پیدا کرنے کے لئے یہی واحد فارمولا ہے جو قابل عمل ہے اور اسی کے ساتھ فطرت کے مطابق بھی۔

عظیم نقصان

"تمام مذاہب سچے ہیں" کا نظریہ کوئی بے خطر نظریہ نہیں۔ اس میں ایک عظیم نقصان چھپا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ مذہب کے نام سے لوگوں کے پاس آخر کار صرف عصبیت باقی رہے۔ بہت سے لوگ ہمیشہ کے لئے سچے مذہب کی نعمت سے محروم ہو جائیں۔

مذہب کے سوا دوسرے معاملات میں ڈائیلاگ اور بحث و مباحثہ کو پسند کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اصل حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً کچھ لوگ اپنے باپ دادا سے سن کر اگر یہ مان لیں کہ زمین چوکور ہے۔ اور اس عقیدے کے ساتھ ان کے جذبات اتنے زیادہ وابستہ ہو جائیں کہ وہ اس موضوع پر بحث کو پسند نہ کریں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ وہ

زمین کی اصل حقیقت کے بارے میں ہمیشہ اندھیرے میں رہیں گے۔

یہی معاملہ مذہب کا بھی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان بنیادی اختلافات ہیں۔ اب اگر یہ مان لیا جائے کہ تمام مذاہب سچے ہیں تو اس کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ لوگ محض عصبیت کے تحت اپنے اپنے آبائی مذہب سے جڑے رہیں گے اور حقیقی مذہب تک کبھی نہیں پہنچیں گے۔

مذہب انسان کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس سے انسان کا مستقبل بندھا ہوا ہے۔ ''تمام مذاہب سچے ہیں'' کا نظریہ لوگوں کو جس نتیجہ تک پہنچائے گا وہ یہ کہ لوگ مذہب کے نام پر محض اپنی عصبیتوں سے جڑے رہیں گے اور حقیقی مذہب کی نعمت سے کبھی آشنا نہ ہوں گے۔

کنورزن کا مسئلہ

کنورزن کے معاملہ میں ایک نقطہ نظر وہ ہے جس کو معروف طور پر مذہبی نقطہ نظر سمجھا جاتا ہے۔ یعنی ایک مذہبی گروہ کے آدمی کا اپنے مذہب کو بدل کر دوسرے مذہبی گروہ میں شامل ہو جانا۔ مذہبی اصطلاح میں تبدیلی مذہب (proslytism) کہا جاتا ہے۔ مگر یہ کنورزن کا ایک بہت محدود تصور ہے۔ اس کے علاوہ کنورزن کا ایک اور وسیع مفہوم بھی ہے۔ اس کو ایک لفظ میں کنورزن کا سائنٹفک نقطۂ نظر کہا جاسکتا ہے۔

کنورزن کے بارے میں جو مذہبی نقطۂ نظر ہے اس کا تعلق صرف مذہبی روایت سے ہے۔ اس اعتبار سے وہ نسبتاً ایک محدود نقطۂ نظر ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر کا دائرہ، اس کے مقابلہ میں، بہت زیادہ وسیع ہے۔ وہ خود فطرت کے ابدی اصولوں پر مبنی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذہبی معنوں میں کنورزن کسی انسان کے لئے اس کے اپنے چوائس کا معاملہ ہے۔ مگر سائنٹفک معنوں میں کنورزن انسانی چوائس کا معاملہ نہیں۔ وہ زندگی کا ایک اٹل قانون ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح فطرت کے دوسرے قوانین اٹل قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سائنٹفک کنورزن کے اصولوں کو ہم اسی طرح ماننے پر مجبور ہیں جس طرح ہم شام کے بعد صبح کو مانتے ہیں یا ایک موسم کے بعد دوسرے موسم کے آنے پر یقین رکھتے ہیں۔

میں نے خدا کے فضل سے اسلام کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے سائنس کو بھی پڑھا ہے۔ اس دو طرفہ مطالعہ کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کنورزن کے معاملہ میں سائنس یا فطرت کا جو اصول ہے عین وہی خود اسلام کا اصول بھی ہے۔ اس معاملہ میں دونوں کے درمیان کوئی حقیقی فرق یا اختلاف نہیں۔

اسلام اور کنورزن

اسلام کنورزن کی حمایت کرتا ہے۔ مگر اسلام کے نزدیک کنورزن رسمی مفہوم میں محض

تبدیلیٔ مذہب (proselytism) کے ہم معنی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ذہنی انقلاب (intellectual revolution) یا روحانی تغیر (spiritual transformation) کے نتیجہ میں ایک شخص کی زندگی میں پیش آتا ہے۔ یہ سادہ طور پر ایک مذہبی ڈھانچہ سے نکل کر دوسرے مذہبی ڈھانچہ میں جانا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی نے اپنی تلاش و تحقیق کے ذریعہ سچائی کو دریافت کیا۔ اور پھر اپنے ذاتی فیصلے کے تحت ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرلیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ۶ھ کے آخر میں اس زمانہ کے پڑوسی حکمرانوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے تھے۔ ان خطوط میں ان کو اسلام قبول کرنے کی براہ راست طور پر دعوت دی گئی تھی۔ مثال کے طور پر آپ نے بازنطینی حکمراں ہرقل (Heraclius-1) کے نام دعوتی مکتوب روانہ کیا تو اس میں یہ الفاظ لکھے۔ "اسلم تسلم" (اسلام لاؤ تم سلامتی پاؤ گے) اسی طرح مکہ میں جہاں کہیں لوگوں کا مجمع ہوتا وہاں جاکر آپ فرماتے "ایھاالناس قولوا لا الہ الااللہ تفلحوا" (اے لوگو! کہو کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، تم فلاح پاؤ گے)

یہ بظاہر لوگوں کو مذہب بدلنے کی دعوت تھی۔ مگر قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقۃً تبدیلیٔ فکر کی دعوت تھی نہ کہ سادہ طور پر محض مذہب بدل لینے کی۔ اسلام کے دور اول میں عرب کے کچھ دیہاتی لوگ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگئے جب کہ ان کے اندر گہرے قسم کی کرداری تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ان کے بارے میں قرآن میں یہ سخت آیت اتری۔ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، کہو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کی، اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا (الحجرات ۱۴) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں کنورزن کا مطلب ایک انسان کی پوری زندگی کی تبدیلی ہے نہ کہ معروف معنوں میں صرف مذہب کی تبدیلی۔

اسی طرح قرآن میں یہود و نصاریٰ کے طریقہ پر نقد کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: کہو کہ

ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کیا۔ اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں (البقرہ ۱۳۸) یہود و نصاریٰ کے یہاں مذہب بدلنے کا ایک رسمی طریقہ رائج تھا جس کو اصطباغ یا بپتسمہ (baptism) کہا جاتا ہے۔ اس رسم میں آدمی کو پانی میں غوطہ دیا جاتا تھا۔ وہ پانی کے رنگ کو پاکی کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہبی پیشوا کے ذریعہ صاف پانی میں غوطہ دینے سے ایک ناپاک آدمی پاک ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ نئے مذہب میں داخل ہو جاتا ہے۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں کہا گیا کہ جسم کے اوپر ظاہری طور پر پانی ڈالنے سے کوئی شخص پاک نہیں ہوتا۔ پاکی یہ ہے کہ آدمی کی پوری شخصیت بدل جائے، اس کے اندر اللہ کا رنگ داخل ہو جائے، وہ اپنے قول و عمل میں پوری طرح خدائی طریقہ کو اختیار کر لے۔

اس معاملہ میں قرآن یہاں تک جاتا ہے کہ وہ رسمی تبدیلیٔ مذہب کی سرے سے تصدیق ہی نہیں کرتا۔ قدیم مدینہ میں تقریباً تین سو آدمی ایسے تھے جو اسلام کا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ بظاہر نماز روزہ بھی کرتے تھے مگر یہ سب کچھ انھوں نے اوپری طور پر یا منافقانہ طور پر کیا تھا۔ ان کی اندرونی حالت ان کے ظاہری اقرار کے موافق نہیں تھی۔ وہ زبان سے اسلام کا دعویٰ کرتے تھے مگر قلبی کیفیت کے اعتبار سے ان کے اندر اسلام کی اسپرٹ موجود نہ تھی۔ ایسے لوگوں کے اسلام کو قرآن میں جھوٹا اسلام کہا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ: جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ بیشک تم اس کے رسول ہو، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں۔ (المنفقون۔۱)

قرآن کے مطابق تبدیلیٔ مذہب سے مراد کیا ہے۔ اس کا اندازہ چند آیتوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں ایک واقعہ کا ذکر ہے جب کہ تقریباً ستر عیسائیوں کے ایک مجمع میں قرآن کی آیتیں پڑھی گئیں۔ اس کو سن کر وہ لوگ تڑپ اٹھے اور اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے: اور جب

انھوں نے اس کلام کو سنا جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہیں اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کرے۔ (المائدہ ۸۳۔ ۸۴)

اسی طرح قرآن میں ایمان لانے والوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس درجے اور مغفرت ہیں اور ان کے لئے عزت کی روزی ہے۔ (الانفال ۲۔ ۴)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک تبدیلی مذہب حقیقت میں وہ ہے جو معرفت (realisation) کے نتیجہ میں پیش آئی ہو، جب کہ ایک انسان کی تلاش حق اپنی تلاش کا قابلِ یقین جواب پالے۔ یہ پانا اس کے لئے اتنا گہرا تجربہ ہو کہ اس کا دل تڑپ اٹھے۔ اس کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔ اس کا پورا وجود اس سچائی کے رنگ میں ڈھل جائے۔ اس کے بعد وہ ایک نیا اور بالکل مختلف انسان بن جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کنورزن کے ہم معنی کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ کنورزن کے معاملہ کو بتانے کے لئے دوسرے زیادہ بامعنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن جس دعوتی مشن کے تحت اتارا گیا ہے اس کا تذکرہ قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے: بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک ظاہر کرنے والی کتاب آچکی ہے۔ اس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور اپنی

توفیق سے ان کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لا رہا ہے اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ (المائدہ ۱۵۔۱۶)

اسی طرح جو لوگ قرآن کے مطالعہ سے متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہوتے ہیں ان کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے: جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے وہ حق ہے، کیا وہ اس کے مانند ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔ نصیحت تو عقل والے لوگ ہی قبول کرتے ہیں (الرعد ۱۹) اس آیت کے مطابق، حقیقی کنورزن وہ ہے جو علم کی سطح پر واقع ہو، جس میں آدمی یہ محسوس کرتا ہو کہ وہ نہ جاننے کے مرحلہ سے نکل کر جاننے کے مرحلے میں داخل ہوا ہے۔ اسی لئے حدیث میں داخلۂ اسلام سے پہلے کے دور کو "جاہلیت" کہا گیا ہے، یعنی بے خبری کا دور۔

اسی طرح قرآن میں مومن اور غیر مومن کے فرق کو موت کے بعد زندگی پانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ: کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندگی دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے، وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے، اس سے نکلنے والا نہیں۔ (الانعام ۱۲۳)

اس حقیقت کو قرآن میں مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ زمین کی تمثیل کے ذریعہ اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو زرخیز زمین ہری بھری فصل سے لہلہا اٹھتی ہے۔ اسی طرح جن افراد کے دلوں میں استعداد ہے وہ سچائی کو پا کر جاگ اٹھتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے: اور جو زمین اچھی ہے اس کی پیداوار نکلتی ہے اس کے رب کے حکم سے اور جو زمین خراب ہے اس کی پیداوار صرف ناقص نکلتی ہے۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیاں مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان کے لئے جو شکر والے ہیں۔ (الاعراف ۵۸)

اس بات کو قرآن میں ایک اور مقام پر اس طرح بیان کیا گیا ہے: کیا تم نے نہیں دیکھا، کس طرح مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ زمین

میں جمی ہوئی ہے۔اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔وہ وقت پر اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے اور اللہ لوگوں کے لئے مثال بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔اور کلمہ ٔخبیثہ کی مثال ایک خراب درخت کی ہے جوزمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے۔اس کو کوئی ثبات نہ ہو۔اللہ ایمان والوں کو ایک پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط کرتا ہے۔اور اللہ ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے۔اور اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ (ابراہیم ۲۴۔۲۷)

قرآن کی ان آیتوں میں اس فرق کو بتایا گیا ہے جو سچائی کو پائے ہوئے انسان اور سچائی کو نہ پائے ہوئے انسان کے درمیان ہوتا ہے۔جو آدمی سچائی کو نہ پائے وہ گویا ایک ایسی جھاڑی کی مانند ہے جو زمین کے اوپر اگ آتی ہو۔ایسی جھاڑی کچھ دن تک بے فائدہ طور پر زمین کے اوپر رہتی ہے۔اور اس کے بعد وہ یا تو خود مٹ جاتی ہے یا اکھاڑ کر پھینک دی جاتی ہے۔اس کے برعکس ایک مفید اور پھل دار درخت زمین کے اوپر اس طرح اگتا ہے جیسے کہ وہ زمین کے لئے ہے اور زمین اس کے لئے۔وہ زمین اور فضا سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہوئے خوب ترقی کرتا ہے۔اس سے لوگوں کو ہر قسم کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔وہ زمین پر ایک مطلوب اور بامعنی وجود کے طور پر کھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

کنورزن ـــــ ایک آفاقی اصول

اس معاملہ کا ایک پہلو اور ہے جس کی طرف قرآن میں بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔وہ یہ کہ کنورزن کا معاملہ محدود طور پر صرف مذہب کی تبدیلی کا معاملہ نہیں ہے۔بلکہ یہ ایک آفاقی اصول ہے۔موجودہ کائنات میں تمام ترقیاں اسی کنورزن کے طریقہ پر ظہور میں آئی ہیں۔ کائنات اپنی ابتدا میں ایک بند مادہ کی صورت میں تھی، پھر اس میں داخلی تغیر ہوا۔یہ بند مادہ کھل کر پھیلنا شروع ہوا یہاں تک کہ موجودہ وسیع کائنات بن گئی۔(الانبیاء۔۳۰) زمین سوکھی پڑی ہوئی ہوتی ہے پھر بارش کے ذریعہ اس میں تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔یہاں تک کہ چٹیل میدان ہری بھری فصلوں اور شاداب درختوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔(الحج ۵)

اسی طرح کچھ بظاہر غیر ذی روح اجزاء ایک مادہ کے بطن میں مخصوص تغیرات کے مراحل سے گزرتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک مکمل قسم کے ذی روح وجود کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس کا نتیجہ چلتے پھرتے انسان اور چلتے پھرتے حیوان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے (الانعام ۹۶) اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک گائے کے پیٹ میں گھاس اور دانا داخل ہوتا ہے۔ وہ اس کے اندر ایک قدرتی نظام کے تحت کچھ تغیراتی مراحل سے گذرتا ہے یہاں تک کہ وہ دودھ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو انسان کے لئے ایک نہایت قیمتی غذا ہے۔ (النحل ۶۶) وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے قدرتی مظاہر کی مثال دے کر قرآن میں یہ حقیقت بتائی گئی ہے کہ یہ دنیا کنورزن کے عالمی اصول پر قائم ہے۔ یہاں ہر قسم کی ترقیاں ہمیشہ تغیراتی عمل (process) سے گذر کر وقوع میں آتی ہیں۔ ایک چیز اپنی ابتدائی حالت میں کچھ ہوتی ہے، اور پھر اس پر تغیر و تبدل کا عمل واقع ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ چیز ایک نئی بہتر چیز بن جاتی ہے...... دو قسم کے بادلوں کے ٹکراؤ سے نائٹروجن کا پیدا ہونا، دو قسم کی گیسوں کے ملنے سے پانی کا وجود میں آنا، خام لوہے کا متغیر ہو کر اسٹیل بن جانا۔ مختلف قسم کے کیمیکل کی آمیزش سے نئی نئی مفید دھاتوں کا بننا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب وسیع تر معنوں میں کنورزن کی مثالیں ہیں۔ یہی کنورزن انسانی افکار کی دنیا میں بھی کار فرما ہے۔ اس دنیا میں مسلسل طور پر افکار کے درمیان ٹکراؤ جاری ہے۔ اسی ٹکراؤ کے عمل سے ایک فکر تبدیل ہو کر دوسرے زیادہ بہتر فکر کی صورت اختیار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دنیا میں سینکڑوں سال تک شمسی نظام کے بارے میں زمین مرکزی نظریہ (geo-centric theory) کا غلبہ تھا۔ پھر فکری تصادم کے نتیجہ میں اس میں تغیر شروع ہوا۔ یہاں تک کہ زمین مرکزی نظریہ کو علمی دنیا میں رد کر دیا گیا اور اس کی جگہ آفتاب مرکزی نظریہ (helio-centric theory) کو زیادہ صحیح قرار دے کر اس کو قبول کر لیا گیا، وغیرہ۔

افکار کی دنیا میں اسی کنورزن کی ایک مثال وہ ہے جس کو مذہبی کنورزن کہا جاتا ہے۔ اس

اعتبار سے مذہبی کنورزن فطرت کی وسیع تر اسکیم کا صرف ایک جزء ہے۔ یہ جزء بھی اتنا ہی مطلوب اور ضروری ہے جتنا کہ اس کا کل۔

حقیقت یہ ہے کہ کنورزن فطرت کا قائم کردہ ایک عالم گیر قانون ہے۔ مادی دنیا کی تمام ترقیاں اسی کنورزن کے اصول پر ہو رہی ہیں۔ زندہ اشیاء (انسان اور حیوان) کا جسمانی ارتقاء تمام تر اسی کنورزن کے اصول پر ہوتا ہے۔ اسی طرح افکار کی دنیا میں ہزاروں سال سے جو ترقیاں ہو رہی ہیں وہ سب کی سب اسی کنورزن کے اصول کو اختیار کرنے کی بنا پر ہو رہی ہیں۔ یعنی ایک چیز کو حق پاکر پوری طرح اختیار کرلینا۔ اس دنیا کا کوئی بھی ترقیاتی واقعہ اس کنورزن کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی معاملہ مذہب کا بھی ہے جو کہ روحانی سچائی کا دوسرا نام ہے۔ وہی مذہب کسی انسان کا مذہب بن سکتا ہے جس کو کسی آدمی نے ذاتی تلاش کے نتیجہ میں دریافت کیا ہو۔ مذہب کا نہایت گہرا تعلق یقین سے ہے اور یقین کا تعلق دریافت (discovery) سے۔ دریافت کے بغیر یقین نہیں، اور یقین کے بغیر مذہب نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص پیدائشی طور پر سچے مذہب کے ماحول میں پیدا ہو تب بھی وہ صرف آبائی تعلق کی بنا پر اس مذہب کو نہیں پاسکتا۔ مذہب کو بطور ایک یقینی صداقت کے پانا اس کے لئے صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ وہ خود اپنے مطالعہ اور غور و فکر کے ذریعہ اس کو پائے، وہ ایک معلوم چیز کو دوبارہ دریافت (re-discover) کرے۔

کنورزن کی حقیقت

کنورزن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی کچھ رسمی الفاظ ادا کرے۔ اور اپنا نام بدل کر ایک کلچرل گروپ کو چھوڑ کر دوسرے کلچرل گروپ میں شامل ہو جائے۔ کنورزن کا مطلب تبدیلیٔ مذہب نہیں بلکہ تبدیلیٔ شخصیت ہے۔ کنورزن یہ ہے کہ ایک آدمی تلاش حقیقت میں سرگرم ہو۔ تحقیق و جستجو کے تمام مراحل سے گزرے اور پھر اس کے نتیجہ میں اس کے اندر ایک نئی شخصیت کا ارتقاء ہو۔ کنورزن اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک نئی شخصیت کے ظہور کا نام ہے۔ ایسی ایک

شخصیت کا بننا انسانی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ جب کسی سماج میں بڑی تعداد میں پیدا ہو جائیں تو وہ تاریخ کا عظیم ترین کارنامہ ظہور میں لاتے ہیں۔

کنورزن در حقیقت ڈسکوری (دریافت) کے نتیجہ میں پیش آنے والا واقعہ ہے۔ ایک عظیم ڈسکوری کے بعد آدمی وہی نہیں رہتا جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ اب وہ مکمل طور پر ایک نیا انسان ہوتا ہے۔ اسی قسم کی انقلابی تبدیلی کا نام کنورزن ہے۔ یہ تمام تر ذاتی فیصلہ کے تحت ہوتا ہے۔ کسی خارجی لالچ یا دباؤ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

کنورزن کا مطلب یہ ہے کہ ایک نہ پایا ہوا انسان پایا ہوا انسان بن جائے۔ ایک بے خبر انسان باخبری کے دور میں پہنچ جائے۔ ایک سویا ہوا انسان اپنے حواس کے ساتھ جاگ اٹھے۔ ایک شخص جو اندھے پن میں جی رہا تھا وہ بینا بن کر جینے کے قابل ہو جائے۔ ایک شخص جس کو اپنی کوششوں کا مرکز نہیں ملا تھا اس کو اپنی کوششوں کا ایک معلوم مرکز مل جائے۔ ایک شخص جو محدود دنیا میں جی رہا تھا وہ لامحدود دنیا میں داخل ہو کر سانس لینے لگے۔ ایک شخص جو صرف اپنے جسم کے دائرہ میں جی رہا تھا وہ اس سے اوپر اٹھ کر فکر کی اعلیٰ سطح پر جینے کا سامان کرلے۔ ایک شخص جو بے مقصد حالت میں بھٹک رہا تھا اس کو بامقصد زندگی کا راز معلوم ہو جائے۔

صحت مند مقابلہ

۹۹-۱۹۹۸ کے درمیان ہندستان کی بعض ریاستوں (گجرات، اڑیسہ) میں کچھ نچلی ذات کے ہندو اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائی ہو گئے۔ اس پر کچھ انتہا پسند ہندو بھڑک اٹھے۔ انھوں نے عیسائیوں کے خلاف نفرت کا پرچار کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے عیسائیوں کے سیکڑوں گھروں اور گرجاؤں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ کئی عیسائیوں کو زندہ جلا کر مار دیا، وغیرہ۔

مذکورہ واقعہ پر ایک ردّ عمل کی مثال یہ تھی۔ دوسرے ردّ عمل کی مثال وہ ہے جو پروفیسر امرتیہ سین کی زندگی میں ملتی ہے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ان کو اکنامکس کا نوبیل پرائز دیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ہندستان آئے تو مذکورہ قسم کے ہندوؤں نے ان کے بارے میں یہ کہنا شروع

کیا کہ امرتیہ سین کو جو نوبیل پرائز دیا گیا ہے وہ مغربی قوموں کی ایک سازش ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ امرتیہ سین کو اپنا ایجنٹ بنائیں اور ان کے ذریعہ ہندستان میں عیسائی کنورزن کی تحریک کو فروغ دیں۔ جب وہ ہندستان آئے تو یہاں کے ایک صحافی نے ان سے پوچھا کہ آپ کے خلاف جو الزام لگایا گیا ہے اس پر آپ کا تبصرہ کیا ہے۔ ٹائمز آف انڈیا (۲۹ دسمبر ۱۹۹۸) کی رپورٹ کے مطابق، پروفیسر امرتیہ سین نے اس کا یہ جواب دیا:

I am not expected to respond to something like this.

کنورزن کے واقعہ پر کٹر وادیوں کی مذکورہ منفی روش ہر پہلو سے قابل رد ہے۔ وہ اصولی اعتبار سے مکمل طور پر غلط ہے اور عملی اعتبار سے تباہ کن حد تک بے نتیجہ۔ صحیح رد عمل یہ ہے کہ اس واقعہ کو چیلنج کے روپ میں لیا جائے۔ اس معاملے کو اگر چیلنج کے روپ میں لیا جائے تو اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ اس کے بعد یہاں دونوں گروہوں کے درمیان صحت مند مقابلہ (healthy competition) جاری ہو جائے گا جو ہر اعتبار سے ملک و قوم کے لئے مفید ہو گا۔

اس سے پہلے انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اسی قسم کی صورت حال پیش آئی۔ اس وقت ملک میں نفرت کی فضا موجود نہ تھی اور نہ موجودہ قسم کے غیر سنجیدہ لیڈر اس وقت ہمارے یہاں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ دونوں گروہوں کے درمیان خاموش طور پر ایک صحت مند مقابلہ شروع ہو گیا۔ دونوں ہی گروہوں میں ایسے لوگ اٹھے جنھوں نے اپنے اپنے مذہب کو زیادہ پرکشش انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف ہندوؤں میں آروبندو، سوامی وویکانند، راج گوپال اچاری، ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے لوگ اٹھے۔ انھوں نے ہندو مذہب کو جدید اسلوب اور جدید اصطلاحوں میں پیش کیا۔ دوسری طرف مسلمانوں میں شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر اقبال، سید ابو الاعلیٰ مودودی جیسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اسلام کو جدید انداز اور جدید دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے رکھا۔

اس طرح دونوں گروہوں کے درمیان بلا اعلان ایک صحت مند مقابلہ شروع ہو گیا۔

دونوں طرف سے تحریر اور تقریر کے ذریعہ مذہب کی ایسی نمائندگی کرنے کی کوشش کی گئی جو جدید ذہن کے لئے قابل قبول ہو سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کنورزن کا مسئلہ زحمت میں رحمت (blessing in disguise) بن گیا۔ دونوں طرف کے مذہبی افکار میں ترقی ہوئی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے فائدہ پہنچا۔

اب موجودہ صورت حال میں بھی ضرورت ہے کہ دوبارہ یہی صحت مند مقابلہ جاری کیا جائے۔ نفرت اور تشدد کے بجائے محبت اور انسانیت کی قدروں کو بڑھاوا دیا جائے۔ ملک کے مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان پر امن ڈائیلاگ ہونے لگے۔ مذہبی تعارف کے لئے آل مذاہب کانفرنسیں منعقد کی جائیں۔ ہر مذہب کے لوگ اپنے مذہب کی تعلیمات اور تاریخ پر علمی کتابیں مرتب کر کے شائع کریں۔ مذہب کے دائرے میں بھی وہی آزادانہ ڈسکشن ہونے لگے جو آج بھی سیکولر حلقوں میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

کنورزن کے سوال پر اس قسم کا ردعمل اگر سامنے آئے تو وہ ہر مذہبی گروہ کے لئے غیر معمولی فائدے کا باعث بنے گا۔ مذہبی مسائل زیادہ واضح ہو کر سامنے آئیں گے۔ سچائی کی تلاش کا ایک نیا عمل جاری ہو جائے گا۔ چھپی ہوئی حقیقتیں ظاہر ہونے لگیں گی۔ مذہب کی دنیا کا جمود ٹوٹے گا اور ہر طرف زندہ مذہب کا ماحول قائم ہو جائے گا۔

مزید یہ کہ فطرت کے عام اصول کے مطابق، یہ ذہنی بیداری صرف مذہب کے دائرے تک نہیں رہے گی بلکہ وہ بڑھتے بڑھتے عمومی دائرے تک پہنچ جائے گی۔ ایک اعتبار سے جمود و تعطل کا ٹوٹنا ہر اعتبار سے جمود و تعطل کے ٹوٹنے کے ہم معنی بن جائے گا۔ مذہب کی بیداری زندگی کے دوسرے تمام شعبوں میں بیداری لانے کا سبب بنے گی۔ یہاں تک کہ پورا ملک اس سے متاثر ہوگا، ایک قوم جو آج بظاہر سوئی ہوئی دکھائی دیتی ہے وہ پوری طرح جاگ اٹھے گی۔ اور یہ سب کچھ صرف اس لئے ہوگا کہ ہم نے ایک مسئلہ کو چیلنج کے روپ میں لیا اور صحت مند مقابلہ کی صورت میں اس کا سامنا کیا۔

کنورزن ـــــ ایک صحت مند تاریخی عمل

غالباً ۱۹۹۰ میں میں نے ایک ہندستانی رائٹر کی ایک کتاب پڑھی تھی۔ اس کا نام کنورزن کی سیاست (Politics of Conversion) تھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ اس کتاب سے مجھ کو صرف ایک اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ کتاب کا نام (ٹائٹل) درست نہیں۔ اس کا صحیح نام ہونا چاہئے: کنورزن کو سیاسی بنانا (Politicisation of Conversion) یعنی ایک سادہ فطری حقیقت کو سیاسی رنگ دے کر اس میں غیر ضروری طور پر سنسنی خیزی پیدا کرنا۔

کنورزن کیا ہے۔ عام طور پر کنورزن کو مذہب بدلنے (proslytism) کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ کنورزن اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کنورزن فطرت کا ایک آفاقی قانون ہے۔ وہ ایک صحت مند تاریخی عمل ہے جو ناگزیر طور پر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کنورزن کو روکنے کی کوشش کرنا گویا تاریخ کو روکنے کی کوشش کرنا ہے اور کوئی بھی اتنا طاقتور نہیں کہ وہ تاریخ کے عمل کو روک سکے۔ کنورزن اپنی حقیقت کے اعتبار سے دو چیزوں کے ٹکراؤ سے ایک اور چیز کا پیدا ہونا ہے۔ یہ فطرت کا قائم کردہ ایک آفاقی قانون ہے جو خود اپنے زور پر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عمل اس کے اندر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کارل مارکس نے اس کو غلط طور پر جدلیاتی مادیت (dialectical materialism) سے تعبیر کیا تھا۔ زیادہ صحیح طور پر یہ ڈائیلاگ۔ کنورزن پراسس ہے۔ یعنی جب دو فکری نظام کے درمیان بحث وتبادلہ ہوتا ہے تو اس کے بعد ایک فکری انقلاب برآمد ہوتا ہے۔

ڈائیلاگ۔ کنورزن پراسس کا یہ عمل ہی تمام انسانی ترقیوں کا واحد زینہ ہے۔ جب بھی دنیا میں کوئی تہذیبی انقلاب آیا ہے یا کسی انسانی گروہ نے اٹھ کر کوئی تخلیقی کارنامہ انجام دیا ہے تو وہ ہمیشہ اسی ڈائیلاگ۔ کنورزن پراسس ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا ہے۔

اس عمل کی کوئی ایک صورت نہیں۔ یعنی یہ مذہبی بھی ہو سکتا ہے اور غیر مذہبی بھی۔

پچھلے ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ میں اس کی دو بڑی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ایک مذہبی کنورزن کی صورت میں اور دوسری سیکولر کنورزن کی صورت میں۔

عربوں کی تاریخ مذہبی کنورزن کی مثال ہے۔ چھٹی صدی عیسوی تک عرب ایک مشرکانہ نظام کے تحت محدود قبائلی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے بعد ساتویں صدی کے آغاز میں اسلام یعنی دین توحید کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد دین شرک اور دین توحید کے درمیان زبردست ڈائیلاگ (بحث و مباحثہ) شروع ہوا۔ یہ ڈائیلاگ مزید شدت اختیار کرکے جارحانہ تصادم تک پہنچ گیا۔ اس ڈائیلاگ اور تصادم کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ عربوں کے اندر ایک نئی سوچ ابھری۔ بڑھتے بڑھتے وہ ایک عظیم فکری انقلاب بن گئی۔

اس ذہنی انقلاب یا اس فکر نو کی دریافت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کے اندر ایک نئی شخصیت ابھری۔ ایک یورپی مورخ کے الفاظ میں، ان میں کا ایک ایک شخص اس طرح انقلابی شخصیت بنا کہ پوری قوم ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) بن گئی۔ ہیروؤں کی اس قوم نے صرف پچاس سال کے اندر وہ تاریخی واقعہ برپا کیا جس کو ایک مورخ نے (miracle of all miracles) معجزات کا معجزہ قرار دیا ہے۔ بریفالٹ نے اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ عربوں کے بغیر جدید مغربی تہذیب سرے سے وجود ہی میں نہیں آسکتی تھی :

But for the Arabs, the western civilization would never have arisen at all.

دوسری مثال یورپ کی مسیحی قوموں کی ہے۔ صلیبی جنگوں (crusades) کے بعد کئی سو سال کے تاریخی عمل کے دوران یہاں بھی ایک کنورزن ہوا۔ یہ کنورزن مذہبی نہیں تھا بلکہ ایک قسم کا سیکولر کنورزن تھا۔ چرچ اور سائنس کے درمیان زبردست مقابلہ پیش آیا۔ اس مقابلہ کی ایک روداد مندرجہ ذیل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے:

Conflict between Science and Religion

یہ مقابلہ ڈائیلاگ اور ٹکراؤ کی صورت میں کئی سو سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ یورپی

قوموں کے اندر ایک نیا فکری انقلاب آیا جس میں انھوں نے قدیم کو چھوڑا اور جدید کو اختیار کر لیا۔ اس انقلاب کو عام طور پر نشاۃ ثانیہ (renaissance) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس انقلاب نے یورپی قوموں کو اس قابل بنایا کہ وہ تاریخ کا عظیم ترین کارنامہ انجام دے سکیں۔ وہ تاریخ انسانی کو روایتی دور سے نکال کر سائنسی دور میں پہنچا دیں۔ اصل یہ ہے کہ انسان کا دماغ لامحدود طاقتوں کا ایک قدرتی خزانہ ہے۔ عام حالات میں یہ دماغ سویا ہوا رہتا ہے۔ یہ صرف خارجی جھٹکے ہیں جو اس کو بیدار کرتے ہیں۔ یہ شاک ٹریٹمنٹ کا ایک عمل ہے۔ جتنا بڑا شاک ہوا تنا ہی بڑا ذہنی انقلاب انسان کے اندر پیدا ہو گا۔ یہ شاک ٹریٹمنٹ انسان کے اندر وہ چیز پیدا کرتا ہے جس کو نفسیات کے علماء دماغی طوفان (brainstorming) کہتے ہیں۔ یہ دماغی طوفان آدمی کے اندر ایک نئی فکری تبدیلی، ایک نیا کنورزن، وجود میں لاتا ہے۔ یہ کنورزن کسی قوم کے افراد کو ایک عام انسان سے اٹھا کر غیر معمولی انسان بنا دیتا ہے اور پھر وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکے۔

مذہبی کنورزن اس پورے عمل کا ایک چھوٹا سا جزء ہے۔ تاہم جب ڈائیلاگ۔ کنورزن پراسس چلتا ہے تو اس کو کسی حد کا پابند کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ لوگ فلاں فلاں قسم کا کنورزن کریں، لیکن مذہبی کنورزن نہ کریں۔ یہ ایک لامحدود سیلابی عمل ہے۔ اور سیلاب جب آتا ہے تو وہ کسی حد بندی کو قبول نہیں کرتا۔

جہاں تک مذہبی کنورزن کا تعلق ہے وہ صرف غیر مذہب کو قبول کرنے کے ہم معنی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی کنورزن کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک انرفیتھ کنورزن، دوسری انٹر فیتھ کنورزن۔ مثال کے طور پر سوامی وویکانند پہلے ایک ماڈرن قسم کے نریندر ناتھ تھے۔ پھر رام کرشنا پرم ہنس سے ان کا ذہنی ٹکراؤ ہوا جس کے بعد وہ سوامی وویکانند بن گئے۔ یہ داخلی کنورزن (انرفیتھ کنورزن) کی ایک مثال ہے۔

اس طرح اسی زمانہ کے ایک اور بنگالی ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے (حیدر آباد) کا فکری

تصادم مختلف مذاہب سے ہوا۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے پہلے فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک درجن بڑے بڑے مذاہب کا مطالعہ کیا۔ آخر میں وہ ایک فکری دریافت تک پہنچے۔ انھوں نے اپنے آبائی مذہب ہندوازم کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ اور اپنا نام عزیز الدین رکھا۔ انھوں نے اپنے اس فکری ارتقاء کی داستان ایک کتاب کی صورت میں لکھی ہے جس کا نام یہ ہے: Why I have Embraced Islam یہ انٹرفیتھ کنورزن کی ایک مثال ہے۔

یہ کنورزن کوئی یک طرفہ عمل نہیں ہے۔ یہ دوطرفہ بلکہ کئی طرفہ طور پر چلتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندستان میں کچھ ہندوؤں نے اپنا مذہب بدل کر مسیحی مذہب کو اختیار کر لیا ہے جب کہ یورپ اور امریکہ میں ہزاروں مسیحی اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو بن گئے۔ آج انگریزی میں نکلنے والا سب سے بڑا ہندو اخبار انڈیا ابراڈ (India Abroad) ہے جو امریکہ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا مالک اور اڈیٹر ایک ہندو کنورٹ ہے۔ انھوں نے مسیحیت کو چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کر لیا اور پھر انھوں نے یہ کثیر الاشاعت ہندی اخبار نکالا۔

کسی قوم کو دوبارہ اٹھانے کے لئے عام طور پر تحریک احیاء (revivalism) پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ یعنی قوم کے ماضی کو یاد دلا کر اس کو دوبارہ زندہ کرنا۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اس قسم کی احیائی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ تاریخ میں غالباً کوئی ایک بھی قابل ذکر مثال موجود نہیں جب کہ صرف احیاۓ ماضی کی تحریک کے ذریعہ کوئی قوم دوبارہ نئی طاقت کے ساتھ زندہ ہو کر کھڑی ہو گئی ہو۔ اس کی ایک مثال ہندستان ہے۔ ہندستان میں ہندو قوم کو بیدار کرنے کے لئے پچھلے کئی سو سال سے مسلسل احیائی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس میں بہت بڑی بڑی شخصیتوں کے نام ہیں۔ راجہ رام موہن رائے، سوامی وویکانند، آرووندو، مہاتما گاندھی وغیرہ۔ مگر لمبی مدت کی جدوجہد کے باوجود اس رخ پر ایک فی صد بھی کامیابی نہ ہو سکی۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کا الٹا نتیجہ برآمد ہوا۔

آزادی کے دور میں پہنچ کر ہندو سماج میں اخلاقی اقدار کا وہ نظام بھی باقی نہ رہا جو پہلے اس

کے اندر پایا جاتا تھا۔ پہلے ایک جھوٹ بولنے پر یدھشٹر کا اڑنے والا رتھ زمین پر گر پڑتا تھا، مگر آج کے یدھشٹر صبح وشام جھوٹ بولتے ہیں اس کے باوجود ان کا رتھ نہایت تیزی کے ساتھ بلند فضاؤں میں اڑ رہا ہے۔ ماضی کے برعکس، آج کا ہندستانی سماج صرف ایک کرپشن (بھرشٹاچار) کا سماج بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کے اندر انقلابی روح کبھی بھی "ماضی کی طرف واپسی" سے نہیں پیدا ہوتی۔ یہ صرف جدید کی دریافت سے پیدا ہوتی ہے۔ انقلابی شخصیت کا ظہور قدیم کی طرف واپسی سے نہیں ہوتا بلکہ جدید کی طرف اقدام سے ہوتا ہے اور احیائی تحریک اپنی آخری تعریف کے مطابق صرف قدیم کی طرف واپسی کے ہم معنی ہے۔ وہ جدید کی دریافت یا جدید کی طرف اقدام کے ہم معنی بلاشبہ نہیں۔

سوامی وویکانند نے کہا تھا کہ ہندو قوم ورلڈ لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ مگر یہ انقلابی واقعہ "احیاءِ ماضی" جیسی کسی تحریک کے ذریعہ ظہور میں نہیں آسکتا جیسا کہ اب تک نہیں ہوا۔ ایسا واقعہ جب بھی پیش آئے گا وہ جدید کی دریافت یا نئے فکری انقلاب کے ذریعہ ہوگا۔ خواہ یہ فکری انقلاب مذہبی کنورزن کی صورت میں ہو یا سیکولر کنورزن کی صورت میں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ کنورزن کا یہ واقعہ صرف انفرادی سطح پر نہ ہو بلکہ عوامی سطح پر ہو۔ اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی قوم کوئی بڑا کارنامہ انجام دے سکے اور تاریخ عالم میں اپنا نام روشن کرے۔

خلاصہ یہ کہ کنورزن محدود طور پر مذہبی تبدیلی کا معاملہ نہیں، یہ دریافت نو کا معاملہ ہے۔ اور نفسیات اور تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی فرد یا کسی قوم کو متحرک کرنے کے لئے نیز اس کے اندر اخلاقی انقلاب لانے کے لئے سب سے زیادہ جو چیز موثر ہوتی ہے وہ یہی دریافت (discovery) ہے۔ یہ احساس کہ میں نے ایک ایسی سچائی دریافت کی ہے جو اب تک مجھے معلوم نہ تھی انسان کی تمام سوئی ہوئی طاقتوں کو جگا دیتا ہے۔ وہ ایک عام انسان کی سطح سے اٹھ کر ایک

ہیر و انسان بن جاتا ہے۔ اسی قسم کے ہیر و انسان ہیں جو سمندروں میں چھلانگ لگاتے ہیں، جو پہاڑوں کو پھاند جاتے ہیں، جو اپنے ہیر وانہ کردار کے ذریعہ تاریخ کو نئے دور میں داخل کر دیتے ہیں۔ آج انسانی تاریخ دوبارہ ایک تعطل (deadlock) سے دوچار ہے۔ تاریخ کو دوبارہ انتظار ہے کہ کوئی قوم دریافت نو کے تجربہ سے گذرے۔ وہ نئی انسانی طاقتوں سے بھرپور ہو کر تاریخ انسانی کو وہ دھکا دے جو اس کو ایک نئے اور بہتر دور میں پہنچا دے۔

یکساں سول کوڈ

یکساں سول کوڈ کا تصور آزادی (۱۹۴۷) کے پہلے سے ہندستان میں چلا آرہا ہے۔ مگر اب وہ زیادہ تر دستور ہند کا مسئلہ بن گیا ہے۔ کیوں کہ آزادی کے بعد ملک کا جو دستور بنا اس میں یونیفارم سول کوڈ کے نام سے اس کی بھی ایک باقاعدہ دفعہ شامل کردی گئی۔ یہ دستور کی دفعہ ۴۴ ہے جو اس کے رہنما اصولوں کے تحت درج کی گئی ہے۔

دستور: غیر ضروری طوالت

دستور ایک اعلیٰ قانونی دستاویز ہے۔ دستور کا مقصد ان بنیادی اصولوں کا تعین ہے جس کی روشنی میں قومی حکومت (یا کسی اجتماعی ادارہ) کو چلایا جاسکے۔ خود اپنی نوعیت کے اعتبار سے دستور کو مختصر ہونا چاہیے۔ کیوں کہ دستور جتنا لمبا ہوگا اتنا ہی زیادہ اس میں اختلافات پیدا ہوں گے اور بار بار اس میں ترمیم کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس طرح دستور کا احترام ختم ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ طوالت اور پیچیدگی کی بنا پر آخر کار ایسا ہوگا کہ صرف کچھ ماہرین دستور ہی اس کو جانیں گے۔ عام شہریوں کو اس سے کوئی واقفیت یا دلچسپی باقی نہ رہے گی۔

یہی وجہ ہے کہ بین اقوامی شہرت کے ماہر دستوریات (constitutionalism) وسکانسن یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈیوڈ فلمین (David Fellman) سے لے کر انڈیا کے سب سے بڑے ماہر دستور مسٹر نانی پالکھی والا تک نے مختصر دستور کی حمایت کی ہے۔

موجودہ زمانہ میں تمام ترقی یافتہ قوموں کے دستور نہایت مختصر ہیں۔ مثلاً غیر ترقی یافتہ ریاست جارجیا (Georgia) کا نظر ثانی شدہ دستور پانچ لاکھ (500,000) الفاظ پر مشتمل ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ امریکہ (United States) کا دستور صرف سات ہزار الفاظ پر مبنی ہے۔ اسی طرح جاپان کا دستور انتہائی مختصر ہے جس کو موجودہ زمانہ میں ترقی یافتہ قوموں کے درمیان نمبر ایک قوم کی حیثیت حاصل ہے

(5/85-86)

انڈیا کا دستور غالباً تمام قومی دستوروں میں سب سے زیادہ لمبا ہے۔ بارہ تفصیلی شیڈول (schedules) کے علاوہ اصل دستور ۲۹۵ دفعات پر مشتمل ہے۔ جب کہ اکثر دفعات کی ذیلی دفعات

بھی ہیں۔ اس لمبی دستور سازی کا نادرست ہونا اسی سے ثابت ہے کہ نومبر ۱۹۴۹ کے بعد سے اب تک اس میں تقریباً ۸۰ ترمیمات ہو چکی ہیں اور مزید ترمیم کا مطالبہ جاری ہے۔ ان سب کے باوجود یہ "جامع" دستور ملک کو ترقی کے راستہ پر آگے لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد انڈیا کی دستور ساز اسمبلی کے صدر (۴۹-۱۹۴۶) تھے۔ یہ دستور اگرچہ انھیں کی زیر صدارت بنا اور اس کی تکمیل کے بعد انھوں نے ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ کو اس پر اپنا دستخط کیا۔ تاہم وہ لمبی دستور سازی کے خلاف تھے :

In his valedictory address to the constituent Assembly Dr Rajendra Prasad said that everything cannot be written in the Constitution and hoped for the development of healthy conventions. But these have not been developed and everything has to be written in the Constitution.

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے دستور ساز اسمبلی میں اپنا الوداعی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ دستور میں ہر چیز لکھی نہیں جا سکتی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ صحت مند روایات قائم کی جائیں گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس یہ ذہن بن گیا کہ ہر چیز کو دستور میں لکھ دیا جائے (ہندستان ٹائمس ۲۴ مئی ۱۹۹۵)

کسی دستور کی غیر ضروری طوالت اس میں غیر ضروری دفعات کو شامل کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہندستانی دستور میں اس قسم کی کثیر غیر ضروری دفعات شامل ہیں انھیں میں سے ایک ریاستی پالیسی کے رہنما اصولوں (directive principles) کی دفعہ ۴۴ ہے جو مشترک سول کوڈ سے متعلق ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ریاست اس بات کی کوشش کرے گی کہ انڈیا کے تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ حاصل ہو جائے :

The State shall endeavour to secure for the citizens a uniform civil code throughout the territory of India.

دستور کی یہ دفعہ اتنا ہی غیر دستوری ہے جتنا یہ کہنا کہ ریاست اس بات کی کوشش کرے کہ ملک کے تمام شہریوں کے لیے یکساں فہرست طعام (uniform menu) وجود میں آجائے۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ ملک کے تمام مرد و عورت اور بوڑھے اور بچے ایک ہی قسم کا کھانا کھائیں اور ایک ہی قسم کا لباس پہنیں۔ اسی طرح یہ بھی یقینی طور پر ممکن نہیں ہے کہ ایک بڑے ملک کے تمام مرد و عورت

ایک ہی ڈھنگ پر شادی کی رسوم ادا کریں، خواہ اس کے لیے باقاعدہ قانون کیوں نہ بنا دیا جائے۔
دستور کا کام قومی پالیسی کے بنیادی اصولوں کو متعین کرنا ہے نہ کہ نجی معاملات میں لوگوں کے انفرادی ذوق کو مٹا کر غیر ضروری طور پر یکسانیت لانے کی کوشش کرنا۔

تاہم جب کوئی چیز لکھ کر چھاپ دی جائے تو بہت سے لوگ اس کو واقعہ سمجھ لیتے ہیں۔ یہی حال دستور کی اس دفعہ کا بھی ہوا ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس کا حوالہ دے کر مانگ کرتے رہتے ہیں کہ یکساں سول کوڈ کا دور لانے کے لیے پارلیمنٹ ایک قانون بنائے اور اس کو پورے ملک میں رائج کیا جائے۔

نہرو رپورٹ

پورے ملک کے لیے یکساں سول کوڈ بنانے کا ذہن کافی پہلے سے چلا آرہا ہے۔ غالباً اس کا اظہار سب سے پہلے ۱۹۲۸ میں نہرو رپورٹ کی صورت میں ہوا۔ نہرو رپورٹ حقیقۃً آزاد ہندستان کے دستور کا ایک پیشگی ڈرافٹ تھا جس کو مشہور ماہر قانون موتی لال نہرو نے تیار کیا تھا۔ اس دستوری مسودہ میں تجویز کیا گیا تھا کہ آزاد ہندستان میں شادی بیاہ کے معاملات کو یکساں ملکی قانون کے تحت لایا جائے گا۔ اس وقت علما نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مزید یہ ہوا کہ اس وقت کی برٹش حکومت نے بھی اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس میں ہندستان کے لیے درجۂ مستقرہ (dominion status) کی بات کہی گئی تھی جو انگریزوں کے لیے ناقابل قبول تھی۔

اس کے بعد دسمبر ۱۹۲۹ میں اس پر غور کرنے کے لیے کانگرس کا ایک اجلاس لاہور میں بلایا گیا۔ اس اجلاس نے اس کے عملی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد نہرو رپورٹ کو رد کر دیا۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ

۱۹۸۵ سے یکساں سول کوڈ کے مسئلہ نے نئی قانونی اہمیت اختیار کر لی جب کہ سپریم کورٹ کے ججوں نے اس کے حق میں اپنی رائے دینا شروع کر دیا۔

اس معاملہ میں عدالتی بحث کا آغاز سپریم کورٹ آف انڈیا کے سابق چیف جسٹس مسٹر وائی وی چندرا چوڑ کے فیصلہ سے ہوتا ہے۔ ۱۹۸۵ میں انھوں نے محمد احمد۔ شاہ بانو کیس میں اپنا مشہور فیصلہ دیا تھا۔ اس فیصلہ میں اصل زیر بحث معاملہ سے تجاوز کرتے ہوئے انھوں نے یہ کہنے کی بھی ضرورت محسوس کی

کہ دستور کی دفعہ ۴۴ کے تحت قانون بنانا وقت کا تقاضا ہے۔ اور یہ کہ ایک کامن سول کوڈ قومی ایکتا کو لانے میں مددگار ہوگا :

a common civil code will help the cause of national integration.

اس کے بعد اسی ۱۹۸۵ میں سپریم کورٹ کے جسٹس چن نپا ریڈی نے ایک کیس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیس ایک اور مثال ہے جو اس بات کو نمایاں کرتا ہے کہ یکساں سول کوڈ ہماری فوری اور ناگزیر ضرورت بن چکا ہے :

The present case is yet another which focuses...on the immediate and compulsive need for a uniform civil code.

یہی بات زیادہ مفصل اور تاکیدی انداز میں سپریم کورٹ کی دورکنی ڈویژن بنچ نے مئی ۱۹۹۵ میں اپنے متفقہ فیصلہ میں کہی ہے۔ اس کے ممبران جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس آر ایم سہائے تھے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ دستور کی دفعہ ۴۴ کے مطابق، یونیفارم پرسنل لا کو نافذ کرنا قومی استحکام کی طرف ایک فیصلہ کن قدم ہے۔ اس کا کوئی بھی جواز نہیں ہے کہ کسی بھی وجہ سے ملک میں یونیفارم پرسنل لا کے نفاذ میں تاخیر کی جائے :

to introduce a uniform personal law (is) a decisive step towards national consolidation... There is no justification whatsoever in delaying indefinitely the introduction of a uniform personal law in the country (p. 22).

دستور کی دفعہ ۴۴

یہ ساری باتیں دستور کی دفعہ ۴۴ کے حوالے سے کہی جا رہی ہیں۔ یہ دفعہ دستور ہند کے چوتھے حصہ میں ہے۔ یہ حصہ اسٹیٹ پالیسی کے لیے رہنما اصولوں (directive principles) کی حیثیت سے دستور میں داخل کیا گیا ہے۔ اس کی دفعہ ۳۷ میں یہ صراحت ہے کہ اس حصہ میں جو دفعات درج کی گئی ہیں وہ کسی بھی عدالت کے ذریعہ قابل نفاذ نہیں ہیں۔ اس کا تعلق تمام تر حکومت اور ریاست سے ہے۔ ایسی حالت میں سپریم کورٹ کے ججوں کا بار بار دفعہ ۴۴ کے حوالے سے یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ چھیڑنا ایک ایسے مسئلہ میں دخل دینا ہے جس کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ جنتا دل نے اس

فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے (دی پانیر ۱۵ مئی ۱۹۹۵) اس کو اپنی حد سے گزر کر پارلیمنٹ کی حد میں داخل ہونا قرار دیا :

It is a judicial trespass on Parliament's jurisdiction.

اسی پس منظر میں دی ہندستان ٹائمس (۱۲ مئی ۱۹۹۵) نے اپنے اڈیٹوریل میں فیصلہ پر تبصرہ کا آغاز اس جملہ سے کیا تھا کہ ——— ہندستان کی سپریم کورٹ نے حالیہ برسوں میں بار بار یہ رجحان ظاہر کیا ہے کہ وہ ایسے مقامات میں گھس پڑتی ہے جہاں داخل ہونے سے فرشتے بھی گھبراتے ہیں :

India's Supreme Court in recent years has displayed a penchant for rushing into terrain that angels fear to tread.

خود دستور کے مطابق، یونیفارم سول کوڈ کو ایکٹ کی صورت دینے کا تعلق تمام تر حکومت سے ہے۔ اور حکومت کا حال یہ ہے کہ ۱۹۵۶ میں اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے صاف طور پر کہا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ وہ وقت آگیا ہے کہ میں اس کو تکمیل تک پہنچاؤں :

I do not think that at the present moment the time is ripe in India for me to try to push it through.

یہی بات اس کے بعد اندرا گاندھی نے بھی کہی۔ اور اب موجودہ پرائم منسٹر پی وی نرسمہا راؤ نے بھی یہی بات کہہ دی ہے (ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، ۲۸ جولائی ۱۹۹۵، صفحہ ۷) اب یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کو عملاً یونیفارم سول کوڈ لانا ہے وہ تو اس سے بے تعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اختیار میں سرے سے اس کا معاملہ نہیں وہ اس کے حق میں پر جوش تقریریں کر رہے ہیں۔ اس قسم کی لفظی کارروائی صرف وقت کا ضیاع ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

مذہبی آزادی ایک لازمی حق

جو لوگ دستور کی دفعہ ۴۴ کا حوالہ دے کر یونیفارم سول کوڈ کی وکالت کرتے ہیں۔ انھوں نے غالباً اس پر بہت کم غور کیا ہے کہ خود اسی دستور کی دفعہ ۲۵ میں اس کی تردید موجود ہے۔ دستور ہند کی دفعہ ۲۵ میں ہندستان کے ہر شہری کو ضمیر اور مذہبی عمل اور مذہبی تبلیغ کی پوری آزادی دی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ تمام افراد مساوی طور پر آزادیٔ ضمیر کا حق رکھتے ہیں۔ ان کو حق ہے کہ وہ آزادانہ طور پر مذہب کا اقرار کریں، اس پر عمل کریں اور اس کی تبلیغ کریں :

All persons are equally entitled to freedom of conscience and the right freely to profess, practise and propagate religion.

مذہب کا یہ انتخاب فرد یا گروہ کی خود اپنی مرضی پر منحصر ہوگا۔ اسی لیے دفعہ ۲۵ کی تشریح (explanation I) میں کہا گیا ہے کہ سکھوں کی مذہبی آزادی میں ان کا یہ حق بھی شامل ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق اپنے ساتھ کرپان (تلوار) رکھیں۔ دستور میں "کلچرل رائٹس" کے تحت عمومی طور پر یہ کہا گیا ہے کہ ہندستانی شہریوں کا کوئی بھی طبقہ جو اپنا الگ کلچر اور زبان رکھتا ہو، اس کو حق ہوگا کہ وہ اپنے کلچر اور زبان کی حفاظت کرے (دفعہ ۲۹)

مزید یہ کہ مذہبی آزادی کی دفعہ جو دستور میں ہے وہ دستور کے اس حصہ میں ہے جس کا تعلق شہریوں کے بنیادی حقوق (fundamental rights) سے ہے، جب کہ مذکورہ دفعہ ۴۴ دستور میں دیے ہوئے رہنما اصول (directive principles) کے تحت آئی ہے۔ اور خود دستور کی دفعہ ۳۷ کے مطابق، اس کے رہنما اصولوں کی دفعات اس کے بنیادی حقوق کی دفعات کے تابع ہیں نہ کہ اس سے آزاد۔

ایسی حالت میں دستور کی دفعہ ۴۴ کا حوالہ دے کر حکومت سے یہ کہنا کہ وہ یکساں سول کوڈ کو بذریعہ قانون ملک میں نافذ کرے، خود دستور کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ جب تک ملک میں کوئی گروہ ایسا موجود ہے جو اس قسم کی قانون سازی کو اپنے مذہب میں بے جا مداخلت قرار دیتا ہے، اس وقت تک خود دستور کی رو سے ایسا قانون بنانا ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی پارلیمنٹ ایسا قانون بنائے اور ملک کا کوئی مذہبی گروہ اس کے خلاف سپریم کورٹ میں مرافعہ کرے تو عدالتِ عالیہ جو دستور کی محافظ ہے، وہ یقینی طور پر ایسے قانون کو کالعدم قرار دے دے گی۔

دستور ہند میں مذہبی آزادی کی دفعہ کوئی سادہ بات نہیں ہے۔ یہ انسانی حقوق کے اس عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights) کے تحت ہے جس کو اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ میں جاری کیا تھا، اور جس کا ایک مستقل ممبر ہندستان بھی ہے۔ اس منشور کے آرٹیکل ۱۸ میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ ہر آدمی کو مذہب کی آزادی ہوگی۔ اس میں مذہب بدلنے کی آزادی اور اپنے پسندیدہ مذہب پر عمل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

ہندستان نے اس عالمی منشور پر قومی حیثیت سے اپنا دستخط ثبت کیا ہے۔ اس طرح مذہبی آزادی ہر ہندستانی شہری کا ایک ایسا حق بن جاتی ہے جس کو کسی بھی حال میں ساقط نہیں کیا جا سکتا۔

مذہب اور پرسنل لا

سپریم کورٹ کی مذکورہ دو رکنی ڈویژن بنچ کے ۱۳ صفحہ کے فیصلہ (مئی ۱۹۹۵) میں اس قسم کی قانون سازی کا جواز یہ کہہ کر نکالا گیا ہے کہ نکاح و طلاق کے معاملہ کا تعلق مذہب سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ملکی قانون سے ہے۔ جسٹس کلدیپ سنگھ اپنے فیصلہ میں لکھتے ہیں کہ دستور کی دفعہ ۴۴ اس تصور پر مبنی ہے کہ مہذب سماج میں مذہب اور پرسنل لا کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں۔ اس کی دفعہ ۲۵ مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے جب کہ دفعہ ۴۴ سماجی تعلقات اور پرسنل لا کو مذہب سے الگ کر رہی ہے :

> Article 44 is based on the concept that there is no necessary connection between religion and personal law in a civilised society. Article 25 guarantees religious freedom whereas Article 44 seeks to divest religion from social relations and personal law.

یہ سراسر بے بنیاد بات ہے۔ مذہب کا تعلق، تمام علماء مذہب کے اتفاق کے مطابق، تین چیزوں سے ہے۔ عقیدہ، عبادت، اخلاقی اقدار (ethical values) اور اخلاقی اقدار میں بلاشبہہ یہ بات سرفہرست ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان جائز جنسی تعلق کی صورت کیا ہو۔ نکاح کا تعلق اسی اخلاقی مسئلہ سے ہے، اس لیے وہ لازمی طور پر مذہب میں شامل ہے۔

مذہب اور پرسنل لا کا یہ تعلق اتنا زیادہ واضح ہے کہ خود ڈویژن بنچ کے اسی فیصلہ میں اس کا اعتراف موجود ہے۔ چنانچہ بنچ کے دوسرے رکن جسٹس آر این سہاے اپنے علاحدہ فیصلہ میں لکھتے ہیں کہ شادی، وراثت، طلاق، کنورزن اپنی نوعیت اور حیثیت میں اتنا ہی مذہبی ہیں جتنا کہ عقیدہ۔ آگ کے کنارے سات پھیرا کرنا یا قاضی کے سامنے ایجاب و قبول کرنا بھی اتنا ہی عقیدہ اور ضمیر کا مسئلہ ہے جتنا کہ خود عبادت :

> Marriage, inheritance, divorce, conversion are as much religious in nature and content as any other belief or faith. Going round the fire seven rounds or giving consent before Qazi are as much matter of faith and conscience as the worship itself.

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دلیل سے نکاح کے معاملہ کو مذہب سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اور جب نکاح وطلاق کا معاملہ مذہب کا معاملہ ہے تو دستور کی دفعہ ۲۵ کے مطابق، کسی بھی پارلیمنٹ یا کسی بھی ادارہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی گروہ کے اس مسلّم حق کو اس سے چھین لے اور اس کی مرضی کے بغیر اس کے اوپر ایسا قانون نافذ کرے جو مذکورہ دفعہ کے مطابق، اس کے مذہبی معاملہ میں مداخلت کے ہم معنی ہو۔

کامن کوڈ اور قومی ایکتا

کامن سول کوڈ کا مقصد کیا ہے۔ کوئی بھی شخص یہ نہیں کہے گا کہ کامن کوڈ برائے کامن کوڈ (common code for the sake of common code) ہمارا مقصد ہے۔ پھر اس کا اصل مقصد کیا ہے، اس کے تمام وکیل متفقہ طور پر اس کا ایک ہی فائدہ بتاتے ہیں۔ وہ یہ کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں باہمی قربت پیدا ہوگی۔ اور مشترک قومیت کو وجود میں لانے میں مدد ملے گی۔ کامن کوڈ لوگوں کے اندر کامن فیلنگ پیدا کرے گا۔ اس طرح وہ مضبوط انڈین نیشن وجود میں آجائے گی جس کا پچاس سال سے ہم کو انتظار ہے۔

مگر یہ محض قافیہ بندی کی بات ہے۔ صرف لفظی اشتراک کی بنا پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کامن کوڈ سے کامن فیلنگ کا ظہور ہوگا۔ حالاں کہ دونوں میں کوئی لازمی رشتہ نہیں۔ تمام متعلق حقائق اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں۔

جسٹس کلدیپ سنگھ اپنے فیصلہ میں لکھتے ہیں کہ حکومت نے ہندوؤں کے روایتی قانون کو کوڈ کی صورت دینے کی کوشش کی ہے۔ ہندو میریج ایکٹ ۱۹۵۵، ہندو سکسشن ایکٹ ۱۹۵۶، ہندو مائناریٹی اینڈ گارجین شپ ایکٹ ۱۹۵۶، ہندو اڈاپشن اینڈ مینٹننس ایکٹ ۱۹۵۶ بنایا جاچکا ہے۔ ان قوانین نے روایتی ہندو قانون کی جگہ لے لی ہے جو کہ مختلف مکاتب فکر اور مذہبی کتابوں پر مبنی تھا۔ ان جدید قوانین نے ان سب کو ایک یونیفارم کوڈ کی حیثیت دے دی ہے۔ جب ۸۰ فی صد سے زیادہ شہری پہلے ہی سے مشترک پرسنل قانون کے تحت لائے جاچکے ہیں تو اب اس کا کوئی بھی جواز نہیں ہے کہ ہندستان کے تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کو مزید التوا میں ڈالا جائے (صفحہ ۲)

جسٹس کلدیپ سنگھ مزید لکھتے ہیں کہ آخر حکومت کو کتنا زیادہ وقت چاہیے کہ وہ دستور ہند کی

دفعہ ۴۴ کے تحت دی ہوئی ہدایت کی تعمیل کرے۔ ہندوؤں کا روایتی قانون، ہندوؤں کا پرسنل لا جس کا تعلق وراثت، جانشینی اور شادی بیاہ سے ہے، بہت پہلے ۵۶ ـ ۱۹۵۵ میں قانونی کوڈ کی صورت اختیار کر چکا۔ اب کسی بھی قسم کا کوئی جواز باقی نہیں رہا ہے کہ ملک میں یونیفارم پرسنل لا کے نفاذ میں غیر متعین تاخیر کی جائے۔ ہندوؤں کا پرسنل لا، جس کا تعلق شادی، جانشینی وغیرہ سے ہے، وہ سب اسی طرح مقدس سمجھے جاتے ہیں جیسا کہ مسلمانوں یا عیسائیوں کے قانون۔ مگر ہندو اور ان کے ساتھ سکھ، بدھسٹ اور جینی فرقہ نے قومی اتحاد اور استحکام کی خاطر اپنے جذبات کو بھلا دیا۔ تاہم کچھ اور فرقوں نے ابھی ایسا نہیں کیا ہے، اگرچہ دستور پورے ہندستان میں ایک ہی کامن سول کوڈ نافذ کرنے کی تاکید کرتا ہے (صفحہ ۲۱ ـ ۲۲)

جسٹس کلدیپ سنگھ کے فیصلہ کا جو اقتباس ہم نے اوپر نقل کیا ہے اس موصوف کے نزدیک ملک کی بہت بڑی اکثریت (۸۰ فی صد سے زیادہ) اس مشترک عائلی قانون کے تحت بالفعل لائی جا چکی ہے جس کے لیے وہ مکمل قسم کا یکساں پرسنل قانون بنانے کی پُرزور وکالت کر رہے ہیں۔ پھر جب آبادی کی اتنی بڑی اکثریت میں مطلوب قانون عملاً آچکا ہے تو اس کے وہ مثبت نتائج کہاں ہیں جو اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج بھی ہر سطح پر قومی یک جہتی کا فقدان ہے۔ لوگوں میں کوئی نیشنل کیرکٹر نہیں۔ اسمبلی اور پارلیمنٹ میں اجلاس کے دوران ایسے ہنگامے ہوتے ہیں کہ کارروائی کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ گاؤں پنچایتوں میں پہلے سے بھی زیادہ جھگڑے ہو رہے ہیں۔ عدالتوں میں نزاعی مقدمات کی بھرمار ہے۔ دو مختلف فرقوں سے بھی زیادہ ایک ہی فرقہ کے مختلف طبقات میں ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ اکثر ریاستوں میں علاقائی ہنگامے جاری ہیں۔ حتی کہ کئی ریاستوں میں علاحدگی کی تشددلنہ تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ تمام سیاسی جماعتوں کا سول قانون ایک ہی ہے۔ مگر ان جماعتوں نے اتنے بڑے پیمانہ پر باہمی لڑائی جاری کر رکھی ہے کہ ملک کا استحکام شدید طور پر خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ خود سپریم کورٹ کے مذکورہ جج صاحبان کے فیصلہ کے مطابق، اصل مسئلہ کامن کوڈ کے نفاذ کا نہیں ہے، بلکہ کامن کوڈ کے نفاذ کے باوجود نتیجہ نہ نکلنے کا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں چاہیے کہ ہم دوسری تدبیر تلاش کریں نہ کہ ناکام ہو جانے والی تدبیر کے مزید بے سود اعادہ پر اپنا وقت ضائع کریں۔

باہمی تفریق برٹش کی دین

آج جس "کامن فیلنگ" کی بات کی جارہی ہے وہ اس سے پہلے صدیوں سے ہمارے ملک میں پوری طرح موجود تھی۔ ملک کے مختلف فرقے مل جل کر محبت کے ساتھ باہم زندگی گزارتے تھے۔ حالانکہ اس زمانہ میں کامن سول کوڈ جیسی کسی چیز کا سرے سے کوئی وجود نہ تھا۔ ہر فرقہ کی کلچرل شناخت الگ تھی اور ہر ایک اپنی اپنی مذہبی روایت کے مطابق شادی بیاہ کی رسوم ادا کرتا تھا۔ پھر بھی وہ چیز پوری طرح موجود تھی جس کو قومی یک جہتی کہا جاتا ہے۔

ہندستانی سماج کے اس توازن کو جس چیز نے برہم کیا وہ کوئی غیر کامن کوڈ نہیں تھا، بلکہ سابق برٹش حکومت کی وہ پالیسی تھی جس کو سابق لفٹنٹ جنرل کوک (General Coke) نے فارمولے کی صورت دیتے ہوئے کہا تھا کر لڑاؤ اور حکومت کرو :

Divide and rule

اس غیر مطلوب صورت حال کا ابتدائی آغاز لارڈ ایلگن (James Bruce Elgin) کے زمانہ میں ہوا جو ۱۸۶۲-۶۳ میں ہندستان کا وائسرائے تھا۔ برٹش گورنمنٹ کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر وڈ (Wood) نے لندن سے نئی دہلی میں مقیم وائسرائے کو خط لکھا کہ :

> We have maintained our power in India by playing off one part against the other and we must continue to do so. Do all you can, therefore, to prevent all having a common feeling.

ہم نے ہندستان میں اپنا اقتدار وہاں کے ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ کے خلاف لڑا کر باقی رکھا ہے۔ ہمیں ایسا کرتے رہنا چاہیے۔ اس لیے لوگوں کو مشترک احساس سے روکنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو کرو

(دی ہندستان ٹائمس ۳۰ مارچ ۱۹۹۵)

برٹش حکمرانوں کی یہی سوچی سمجھی پالیسی تھی جس نے ہندستان کی بنی بنائی مشترک قومیت کو بکھیر دیا۔ انھوں نے ہر موقع کو استعمال کر کے لوگوں کے درمیان نفرت کو بھڑکایا۔ انھوں نے حکومت کے تمام ذرائع سے کام لے کر باہمی نفرت کا ایک مصنوعی جنگل اگا دیا۔ بدقسمتی سے آزادی کے بعد بھی یہ آگ بجھائی نہ جا سکی۔ اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ یہی اس کی اصل وجہ ہے۔ اس کے علاوہ یونیفارم سول کوڈ کے ہونے یا نہ ہونے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

یکساں کوڈ یکسانیت کا ذریعہ نہیں

یکساں کوڈ کا کوئی بھی تعلق یکسانیت یا باہمی اتحاد سے نہیں۔ ایک ہی سول کوڈ کو اپنانے والے بار بار آپس میں لڑتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر، قدیم ہندستان میں کورو اور پانڈو دو رشتہ دار خاندان تھے، دونوں کا سول کوڈ ایک تھا۔ اس کے باوجود دونوں میں وہ عظیم جنگ ہوئی جس کو مہا بھارت کہا جاتا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اعلان کیا ہے کہ دہلی کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے اگلے الکشن میں وہ قاتلانہ جبلت (killer instinct) کے ساتھ مہا بھارت برپا کرے گی (ٹائمس آف انڈیا ۲۴ جولائی ۱۹۹۵) اس نئی مہا بھارت کے دونوں فریق دوبارہ وہی لوگ ہیں جن کا سول کوڈ بالکل یکساں ہے۔

پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴) میں ایک طرف جرمنی اور اٹلی وغیرہ تھے، اور دوسری طرف برطانیہ اور فرانس وغیرہ۔ دونوں گروہوں میں ہلاکت خیز جنگ ہوئی۔ حتیٰ کہ مرنے اور شدید طور پر زخمی ہونے والوں کی تعداد ۳۰ ملین تک پہنچ گئی۔ یہ دونوں جنگ آزما فریق عیسائی تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے یہاں وہی سول کوڈ رائج تھا جو کہ دوسرے کے یہاں رائج تھا۔ مگر یہ قانونی یکسانیت دونوں کو آپس میں لڑنے سے روکنے والی ثابت نہیں ہوئی۔ اسی طرح دوسری عالمی جنگ (۱۹۴۵-۱۹۳۹) میں ایک فریق کا قائد جرمنی تھا، اور دوسرے فریق کا قائد برطانیہ۔ دونوں کا کلچر اور سول کوڈ ایک تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف تاریخ کی سب سے زیادہ ہولناک جنگ لڑی۔ دونوں کا "یکساں سول کوڈ" کو ماننا انھیں باہمی جنگ سے روکنے والا نہ بن سکا۔

سابق وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی کو ۱۹۸۴ میں کچھ لوگوں نے مار ڈالا، جبکہ قاتل اور مقتول دونوں کا سول کوڈ ایک تھا۔ پنجاب میں علٰحدگی کی خونیں لڑائی جن دو فریقوں کے درمیان جاری ہوئی وہ دونوں ایک ہی سول کوڈ کو ماننے والے تھے۔ ہر دن اخبار میں شوہروں اور بیویوں کے درمیان ظالمانہ سلوک کے واقعات چھپتے رہتے ہیں، جبکہ دونوں کے دونوں ایک ہی سول قانون سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ عدالتوں میں کروروں ہندستانی ایک دوسرے کے خلاف سنگین الزامات لگا کر قانونی لڑائی لڑ رہے ہیں، حالاں کہ بیشتر حالت میں دونوں فریقوں کا سول کوڈ ایک ہی ہوتا ہے۔ وغیرہ

حقیقت یہ ہے کہ ہم آہنگی اور باہمی اتحاد کے لیے یکساں سول کوڈ کا بے فائدہ ہونا آج ہی معلوم اور ثابت شدہ ہے۔ کوئی نیا قانون بنا کر ازسرنو اس کا مزید تجربہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

دانشوران قوم کا ردعمل

سپریم کورٹ آف انڈیا کی ڈویژن بنچ کا فیصلہ (۱۰ مئی ۱۹۹۵) اخباروں میں چھپا تو برادران وطن اور دانشوران قوم کا ردعمل کثرت سے سامنے آیا۔ ایک طبقہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس کو اس طرح لیا گویا کہ یہ ملک کے موجودہ سماجی مسائل کا کوئی حتمی حل ہے۔ تاہم ان میں قابل لحاظ تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جنھوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اور کسی ایک یا دوسری وجہ سے اس کو رد کر دیا۔ اس دوسرے طبقہ کے چند حوالے حسب ذیل ہیں۔

1. Politics of Uniform Civil Code
by Partha S. Ghosh
The Hindustan Times, New Delhi, May 22, 1995
2. Living with Religion
by Kuldip Nayyar
The Statesman, New Delhi, May 31, 1995
3. Uniform Civil Code: Judiciary Oversteps its Brief
by H.M. Seervai
The Times of India, New Delhi, July 5, 1995
4. Personal Laws: Uniformity no Essential
by Balraj Puri
Indian Express, New Delhi, July 6, 1995
5. Civil Code: The Constitutional Perspective
by K.C. Markandan
The Hindustan Times, New Delhi, June 19, 1995.

نمونہ کے طور پر مسٹر بلراج پوری کے مذکورہ مضمون کے کچھ حصے یہاں اصل انگریزی میں نقل کیے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کامن سول کوڈ کے تصور کو پوری طرح رد کر دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ :

سپریم کورٹ کے معزز ججوں نے قومی اتحاد کا جو تصور پیش کیا ہے اور اس کی حمایت میں انھوں نے جو دلائل دیے ہیں، اس پر میرا اعتراض بہت بنیادی ہے۔ میرے نزدیک جج صاحبان، قومی تعمیر کے عمل میں برعکس طور پر اثر انداز ہوئے ہیں، ہندستانی قوم کے مشترک کردار پر اور مسلمانوں کے درمیان نیز مسلمانوں اور دوسرے فرقوں، خاص کر ہندوؤں کے ساتھ ڈائیلاگ پر جو کہ اس کے پرسنل لا کی اصلاح کے سوال پر جاری تھا۔ یہ کہہ کر کہ مسلم پرسنل لا کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس کو یکساں قانون کا حصہ نہ بنایا جائے، جج صاحبان نے مسلم خواتین کے معاملہ کو مسلمانوں کے علاحدہ تشخص کے تابع کر دیا ہے۔ اور اس طرح انھوں نے ایک اچھے مقصد کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے۔

یکسانیت اور اصلاح کے درمیان قطعی طور پر کوئی بھی منطقی ربط نہیں۔ اول الذکر کے خلاف کیس اتنا ہی ناقابل تردید ہے جتنا کہ وہ مؤخر الذکر کے معاملہ میں ہے۔ یکساں سول کوڈ، قومی اتحاد اور استحکام کے فروغ کے لیے کوئی قطعی چیز نہیں، جیسا کہ جج صاحبان ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ دستور ہند کی اسٹیٹ لسٹ میں ۶۶ اندراجات ہیں اور کانکرنٹ لسٹ میں ۴۷ اندراجات ہیں، جن کے معاملہ میں ریاستوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ الگ الگ قوانین بنا سکتی ہیں، اور ان میں یکسانیت ضروری نہیں ہے۔ اگر ریاستوں کی جغرافی اور ثقافتی عدم یکسانیت کی بنیاد پر بنائے جانے والے غیر یکساں قوانین ملک کے اتحاد کے لیے خطرہ نہیں ہیں تو غیر جغرافی نوعیت کے مذہبی گروہوں میں عدم یکسانیت سے وہ کیوں خطرہ بن جائیں گے۔ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کوئی فرقہ مذہب کی بنیاد پر اپنے لیے علٰحدہ وجود کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ مگر کیا ہم نے زبان کی بنیاد پر علٰحدہ وجود کا اقرار نہیں کیا ہے اور زبان کی بنیاد پر از سر نو ملک کی تنظیم نہیں کی ہے۔ کیا منڈل اصول کے تحت ذات کی بنیاد پر تشخص کو سیاسی جواز نہیں دیا گیا ہے۔ پھر معزز جج کیوں استثنائی طور پر صرف مذہبی گروہ کو علٰحدہ تشخص کا حق دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ ایک غیر منطقی روش ہے، اور سماجی اور سیاسی اعتبار سے مسلّمہ حقائق کے خلاف ہے۔ کیا یہ تشخص محض ایک جج کے اعلان سے ختم ہو جائے گا۔ (انڈین اکسپریس ۶ جولائی ۱۹۹۵)

There is absolutely no logical connection between uniformity and reform. The case against the former is as unassailable as it is for the latter. Nor is uniform law imperative, as the judges argue, for the promotion of national unity and solidarity. There are a number of 66 entries in the State List and 47 in the Concurrent List of the Constitution on which States are empowered to make laws without any obligation to conform to uniformity. If diversity of laws, based on geographical and cultural diversities of the States, has not threatened the unity of the country, would it be threatened only if the diversities are of non-territorial form as are religious communities?

Justice Kuldip Singh has proclaimed that no community could claim to remain a separate entity on the basis of religion. Have not we conceded separate entities based on languages and reorganised the country on a linguistic basis? Have not caste-based identities been recognised in the Mandal principle and all identities, cultural, tribal, caste and religious acquired political legitimacy? Why does the honourable judge single out the claim of a religious community for a distinct identity? It defies logic and socially and politically the accepted reality. Can this identity disappear by a mere pronouncement of a judge?

گرو گولوالکر کے خیالات

آر ایس ایس کے سابق سرسنچالک گرو گولوالکر نے ۲۰ اگست ۱۹۷۲ کو دہلی میں دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ قومی اتحاد کے لیے یکساں سول کوڈ کوئی ضروری چیز نہیں۔ ان کی یہ تقریر مدرلینڈ (۲۱ اگست ۱۹۷۲) میں چھپی تھی۔ اس کے بعد ہفت روزہ آرگنائزر (۲۶ اگست ۱۹۷۲) میں اس موضوع پر ان کا ایک انٹرویو شائع ہوا۔ یہ رپورٹ انگریزی میں اگلے صفحات میں درج کی جارہی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا :

میں نہیں سمجھتا کہ نیشنلزم کا احساس پیدا کرنے کے لیے ہمیں یکساں سول کوڈ کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی قانونی یکسانیت کا قومی اتحاد سے کوئی تعلق نہیں۔ انڈیا ہمیشہ تنوع کا ملک رہا ہے۔ اس کے باوجود لمبی مدت سے ہم ایک طاقتور اور متحد قوم بنے رہے۔ اتحاد کے لیے ہمیں ہم آہنگی کی ضرورت ہے نہ کہ یکسانیت کی۔ میرا احساس یہ ہے کہ فطرت زیادہ یکسانیت کو پسند نہیں کرتی۔ ہمارے پاس زندگی کا بہت لمبا تجربہ ہے، اور ہمارا تجربہ یہ ہے کہ تنوع اور اتحاد دونوں ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دستور ہند میں ایک دفعہ یکساں سول کوڈ کے حق میں موجود ہے۔ مگر ایک چیز محض اس لیے پسندیدہ نہیں ہوجاتی کہ وہ کسی دستور میں لکھی ہوئی ہے۔ بہر حال ہمارا دستور کچھ بیرونی دستوروں کا ملغوبہ ہے۔ اس کو ہندستانی تجربات کی روشنی میں نہیں بنایا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مسلمان یکساں سول کوڈ کے مخالف ہیں، کیوں کہ وہ اپنا علٰحدہ تشخص باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی بھی طبقہ یا فرقہ جو اپنا الگ تشخص چاہتا ہو اس سے میرا کوئی جھگڑا نہیں، جب تک یہ تشخص حب وطن کے جذبات کو گھٹانے والا نہ ہو۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ احساسات ہوں۔ میرے نزدیک مسلمانوں کو اپنے طریق زندگی پر رہنے کا پورا حق ہے، البتہ انھیں ملک سے اور اس کے کلچر سے محبت کرنا چاہیے۔ ہندوؤں کے لیے بھی یکساں سول قانون بنانا غیر ضروری ہے۔ آخر ہزاروں سال سے ہندو اس قسم کے فرق کے باوجود مل جل کر رہ رہے ہیں۔

کسی کو یہ بات فلسفیانہ معلوم ہو سکتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یکسانیت قوموں کے لیے موت کی نشانی ہے۔ فطرت یکسانیت کو پسند نہیں کرتی۔ میرے نزدیک ہر طریق زندگی کی حفاظت کی جانی چاہیے۔ البتہ ان تمام تنوعات کو قومی اتحاد میں مددگار ہونا چاہیے۔

Q. Don't you thing that Muslims are opposing a uniform civil code only because they want to maintain their separate identity?

A. I have no quarrel with any class, community or sect wanting to maintain its identity, so long as that identity does not detract from its patriotic feeling. I have a feeling that some people want a uniform civil code because they think that the right to marry four wives is causing a disproportionate increase in the Muslim population. I am afraid this is a negative approach to the problem.

The real trouble is that there is no feeling of brotherliness between Hindus and Muslims. Even the secularists treat the Muslims as a thing apart. Of course their method is to flatter them for their bloc votes. Others also look upon them as a thing apart, but they would like to flatten out the Muslims by removing their separate identity. Basically there is no difference between the flatterers and the flatteners. They both look upon Muslims as separate and incompatible.

My approach is entirely different. The Muslim is welcome to his way of life so long as he loves this country and its culture. I must say the politicians are responsible for spoiling the Muslims. It was the Congress which revived the Muslim Leage in Kerala and thus caused the increase of Muslim communalism throughout the country.

Q. If we carry this argument backwards, even the codification of the Hindu law would be considered unnecessary and undesirable.

A. I certainly consider the codification of Hindu law as altogether unnecessary for national unity and national integration. Throughout the ages we had countless codes—and we were not any the worse for them. Till recently Kerala had the matriarchal system. What was wrong with that? All law-givers, ancient and modern, are agreed the custom does, and must, prevail over the law.

"Custom is more effective than shastras", say the shastras. And custom is the local or group code. All societies recognise the validity of the local custom or code.

Q. If a uniform civil law is not necessary, why is a uniform criminal law necessary?

A. There is a difference between the two. The civil law concerns mainly the individual and his family. The criminal law deals with the law and order and thousand other things. It concerns not only the individual but also the society at large.

Q. Would it really be correct to allow our Muslim sisters to remain in purdah and be subjected to polygamy?

A. If your objection to Muslim practices is on humanitarian grounds, then that becomes a valid objection. A reformist's attitude in these matters is allright. But a mechanical leveller's attitude would not be correct. Let the Muslims evolve their old laws. I will be happy when they arrive at the conclusion that polygamy is not good for them, but I would not like to force my view on them.

Q. This seems to be a deep philosophical question.

A. It very much is. I think uniformity is the death-knell of nations. Nature abhors uniformity. I am all for the protection of various ways of life. However, all this variety must supplement the unity of the nation and not range itself against it.

(Reproduced from *Manthan Monthly*, New Delhi, July 1986)

Golwalkar on Uniform Civil Law

On August 20, 1972, Shri Guruji, Sarsanghachalak, RSS, inaugurated the Deendayal Research Institute in Delhi. On this occasion he said that a uniform civil code was not necessary for national unity. *The Motherland* of New Delhi carried the following report on August 21, 1970

> New Delhi, August 20—Shri M.S. Golwalkar, Sarsanghachalak of Rashtriya Swayamsevak Sangh, said here today that the present-day Indian politicians lacked original thinking on the problems of Indian society.

Shri Guruji was speaking at the inauguration of the Deendayal Research Institute and the celebration of Sri Aurobindo Centenary by the Institute. Shri R.R. Diwakar, President, Gandhi Peace Foundation, presided. A huge elite audience attended the function in front of the Institute building on Rani Jhansi Road, Jhandewala.

Citing the example of politicians' efforts to solve problems without thinking, he referred to the question of uniform civil code for all in the country, and said that such a uniformity was not necessary in itself; Indian culture permitted diversity in unity. 'The important thing is to infuse a spirit of intense patriotism and brotherhood among all citizens, Hindu and non-Hindu, and make them love this motherland according to their own religion.

In a special interview with *Organiser*, Shri Guruji reiterated his above view. Here is the substance of the conversation, as published in that paper's issue of August 26, 1972:

Q. You don't think that a uniform civil code is necessary for promoting the feeling of Nationalism?

A. I don't. This might surprise you or many others. But this is my opinion. I must speak the truth as I see it.

Q. Don't you think that uniformity within the nation would promote national unity?

A. Not necessarily. India has always had infinite variety. And yet, for long stretches of time, we were a very strong and united nation. For unity, we need harmony, not uniformity.

Q. In the West the rise of nationalism has coincided with unification of laws and forging of other uniformities.

A. Don't forget that Europe is a very young continent with a very young civilisation. It did not exist yesterday and it may not be there tomorrow. My feeling is that nature abhors excessive uniformity. It is too early to say what these uniformities will do to Western civilisation in times to come. Apart from the here and the now, we must look back into the distant past and also look forward to the remote future. Many actions have long-delayed and indirect consequences. We in this country have millennia of experience. We have a tested way of life. And our experience is that variety and unity can, and do, go together.

Q. A Directive Principle of State Policy in our Constitution says that the State would strive for a uniform civil code.

A. That is all right. Not that I have any objection to a uniform civil code, but a thing does not become desirable just because it is in a Constitution. In any case our Constitution is a hotch-potch of some foreign constitutions. It has not been conceived and drafted in the light of Indian experience.

فطرت کا نظام

ذوق دہلوی (۱۷۸۹-۱۸۵۴) اردو زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے :

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

یہ فطرت کا قانون ہے۔ آپ کسی باغ میں کھڑے ہوں تو وہاں ہر پودے اور ہر پیڑ کا انداز جدا ہوگا۔ ہر درخت کا پھول الگ الگ رنگ میں اپنی بہار دکھا رہا ہوگا، پورا باغ تنوعات کا ایک مجموعہ نظر آئے گا۔ حتی کہ چڑیاں بھی الگ الگ آوازوں میں اپنے نغمے سنا رہی ہوں گی۔ وہ کہہ رہی ہوں گی کہ خالق کو ایسا باغ پسند ہے جہاں کوئل کی کوک ہو تو بلبل کے چہچہے بھی ہوں۔ کوئی چڑیا ایک ڈھنگ کی آواز نکالے تو دوسری چڑیا کسی اور ڈھنگ سے فضا میں اپنے گیت بکھیرے۔ ہر چیز تنوع کا ایک نیا نمونہ ہو۔

یہ تنوع اس کائنات کی ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی طرح انسان میں بھی۔ حیاتیات اور نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ نہ صرف انگوٹھے کے نشانات بلکہ ہر آدمی کے سیل دوسرے آدمی کے سیل سے جدا ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کی آنکھ دوسرے آدمی کی آنکھ سے نہیں ملتی۔ یہ اختلاف و تنوع صرف ظاہری حسن کے لیے نہیں ہے۔ اس کے اندر زبردست حکمت چھپی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی تنوع اور اختلاف سے تمام انسانی ترقیاں وابستہ ہیں۔ اسی سے نئی نئی دریافتیں سامنے آتی ہیں۔ اسی سے افکار کا تصادم ہوتا ہے جو آخر کار فکری ارتقار کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی سے باہمی چیلنج پیش آتے ہیں جو انسان کی ذہنی بیداری کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں۔

کسی مجلس میں تمام شرکار کی رائے ایک ہو تو اس سے کوئی نیا آئیڈیا برآمد نہیں ہوگا۔ کسی صنعتی نظام میں اگر تمام انجینیر ایک ہی مولڈ میں ڈھلے ہوئے ہوں تو وہ کسی نئی ٹکنالوجی تک نہیں پہنچ سکتے۔ کسی سماج میں اگر تمام اہل قلم یکساں ذوق کے مالک ہوں تو وہ کوئی تخلیقی ادب ظہور میں نہیں لاسکتے۔ کسی ملک کے سیاست داں اگر سب کے سب ایک ہی سانچہ میں ڈھل کر نکلے ہوں تو وہ کوئی بڑا سیاسی کارنامہ نہیں دکھا سکتے۔

تنوع اور اختلاف اس دنیا کا عام قانون ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں خود اپنے زور پر جاری و ساری ہے۔ کوئی انسان اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔ حتی کہ اگر کوئی طاقت کے زور پر اس نظام کو بدلے تو فطرت کا طوفان اس مصنوعی نظام کو توڑ کر دوبارہ اس کو تنوع کے اصول پر قائم کر دے گا۔

قابل عمل نہیں

حقیقت یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ ایک ناقابل عمل خواب ہے، اس کا داخلی ثبوت خود دستور ہند کے اندر موجود ہے۔ اس کی ایک مثال وہ ہے جو دستور کی دفعہ ۴۴ اور ۳۷۱۔اے کے تقابل کے ذریعہ سامنے آتی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، دستور کی دفعہ ۴۴ میں مقرر کیا گیا ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کے لیے بلا استثناء ایک ہی یونیفارم سول کوڈ بنایا جائے۔ مگر اسی دستور کی ترمیمی دفعہ ۳۷۱۔اے کہتی ہے کہ ناگالینڈ میں ناگاؤں کے درمیان جو مذہبی اور سماجی قاعدے رائج ہیں اور ان کے یہاں جو مختلف روایتی قوانین ہیں، ان کے بارہ میں پارلیمنٹ کوئی قانون نہیں بنائے گی۔ ریاست ناگالینڈ میں وہ بدستور قابل نفاذ رہیں گے۔ اِلّا یہ کہ خود ناگالینڈ کی اسمبلی ان کے بارہ میں ایک تجویز کے ذریعہ ایسا طے کرے:

> No Act of Parliament in respect of (Naga customary laws) shall apply to State of Nagaland unless the Legislative Assembly of Nagaland by a resolution so decides (371-A).

ظاہر ہے کہ ان دونوں دفعات میں تضاد ہے۔ یہ تضاد اسی لیے ہے کہ ہمارے دستور سازوں نے بزعم خود جامع دستور بنانے کے لیے محض تخیل کے زور پر اس میں مختلف چیزیں اکٹھا کر دیں جو حقیقت کی دنیا میں کبھی اکھٹا ہونے والی نہ تھیں۔ غالباً اسی لیے دستور ساز اسمبلی کے ایک سینئر ممبر سر الادی کرشنا سوامی آئر نے دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ مستقبل کا قانون ساز ادارہ ہو سکتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ بنانے کی کوشش کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سرے سے اس کی کوشش ہی نہ کرے:

> The future Legislatures may attempt a uniform civil code or they may not. (Sir Alladi Krishnaswami Aayyar)

قانون کی محدودیت

قانون کوئی بالاتر چیز نہیں۔ دوسری تمام انسانی چیزوں کی طرح انسانی قانون بھی ایک محدود چیز ہے۔ ایک حد کے بعد انسانی سماج پر اس کی گرفت ختم ہو جاتی ہے۔

۱۹۷۵ میں الٰہ آباد ہائی کورٹ نے ایک فیصلہ دیا۔ اس میں اندرا گاندھی کے انتخاب کو نہ صرف رد کیا گیا تھا بلکہ اندرا گاندھی کو چھ سال تک انتخاب میں حصہ لینے کے لیے نااہل قرار دے دیا

گیا تھا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کا اعلان کر کے مزید اضافہ کے ساتھ دہلی کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۸۶ میں یوپی کی ایک عدالت نے اپنے فیصلہ کے تحت بابری مسجد کا بند دروازہ کھلوا دیا تاکہ ہندو آسانی کے ساتھ اس کے اندر پوجا کی رسم ادا کر سکیں۔ بظاہر اس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خوش گوار تعلق قائم کرنا تھا۔ مگر اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد ایسا طوفان برپا ہوا کہ ہندو مسلم تعلقات آخری حد تک بگڑ گئے اور ہندستان سیاسی اور اقتصادی تباہی کے کنارے پہنچ گیا۔

شاہ بانو کیس میں ۱۹۸۵ میں سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ دیا۔ بظاہر اس کا مقصد عورتوں کے ساتھ انصاف کرنا تھا، مگر عملی نتیجہ یہ ہوا کہ راجیو گاندھی گورنمنٹ نے ایک قانون بنا کر سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کو کالعدم کر دیا۔ دوسری طرف بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس معاملہ کو بھرپور طور پر اپنے سیاسی فائدہ کے لیے استعمال کیا۔ یہاں تک کہ ہندستانی پارلیمنٹ میں اس کے ممبروں کی تعداد دو سے بڑھ کر ۱۱۹ تک پہنچ گئی اور کئی ریاستوں میں اس کی حکومت قائم ہو گئی۔

قانون کی محدودیت اس سے بھی ثابت ہے کہ ہندو کوڈ بل ۱۹۵۵ میں اگرچہ کسی ہندو کے لیے صرف ایک ہی نکاح کی اجازت رکھی گئی ہے۔ مگر ۱۹۶۱ کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق، ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی شرح ہندوؤں کے اندر مسلمانوں سے زیادہ ہے :

According to the Indian census report of 1961, the percentage of Hindus having more than one wife was more than that of the Muslims.

انگریزوں نے ہندستان میں اپنے دو سو سالہ اقتدار کے زمانہ میں صرف پانچ سو قانون بنائے۔ ہمارے لیڈروں کو ملک میں ۱۹۴۷ میں اقتدار ملا تو انھوں نے ۴۵ سال کی مدت میں پانچ ہزار سے زیادہ قانون بنا ڈالے۔ مگر اصلاحی قوانین کی کثرت صرف الٹا نتیجہ دینے والی (counter-productive) ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ملک میں جھگڑے بہت بڑھ گئے۔ کرپشن میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ انصاف حاصل کرنا انتہائی دشوار کام بن گیا۔ عورتوں کی حالت ہمیشہ سے زیادہ خراب ہو گئی۔ یہ حالات سماج سدھار کے لیے نئی تدبیر تلاش کرنے کا تقاضا کرتے ہیں نہ کہ قوانین میں مزید اضافے کا۔

تبدیلیٔ مذہب کا مسئلہ

سپریم کورٹ کی ڈویژن بنچ کے سامنے جو پٹیشن تھا اس کا براہ راست کوئی تعلق یونیفارم سول کوڈ سے نہیں تھا۔ یہ پٹیشن دراصل چار ہندو خواتین کی طرف سے عورتوں کی ایک تنظیم کلیانی (Kalyani) نے دائر کیا تھا۔ اس تنظیم کی پریسیڈنٹ شریمتی سرلا مدگل ہیں۔ ان چار ہندو عورتوں نے کہا تھا کہ ہمارے شوہروں نے اسلام قبول کر کے دوسرا نکاح کر لیا ہے، جب کہ انھوں نے ہمیں طلاق نہیں دی۔ ان کا قبول اسلام صرف اس لیے تھا کہ وہ اسلام کے قانون نکاح سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیے دوسری بیوی حاصل کر سکیں۔ اس لیے عدالت ان کے دوسرے نکاح کو کالعدم قرار دے کر ہماری مدد کرے۔

عدالت نے مذکورہ پٹیشن کو منظور کرتے ہوئے چاروں ہندوؤں کے دوسرے نکاح کو کالعدم قرار دے دیا۔ اور ان کو ان کی پہلی بیوی کی طرف واپس لوٹا دیا۔ یہ فیصلہ دیتے ہوئے جسٹس کلدیپ سنگھ لکھتے ہیں :

جب تک ہم اصل منزل تک نہ پہنچیں، یعنی ہندستان کے تمام شہریوں کے لیے یونیفارم سول کوڈ، اس وقت تک یہاں ہندو شوہر کے لیے ایک کھلا محرک (inducement) باقی رہے گا جو کہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہو۔ جب کہ اس کی پہلی بیوی ابھی موجود ہو، ایسا ہندو اپنے مسلم ہونے کا اعلان کر کے دوسری شادی کرے گا۔ چونکہ ہندوؤں کے لیے یک زوجگی کا قانون ہے، اور مسلم قانون چار شادیوں تک کی اجازت دیتا ہے، کوئی کج رو ہندو شوہر ایسا کر سکتا ہے کہ وہ اسلام قبول کرے تاکہ ہندو لا کے ضوابط سے بچ سکے اور دوسری شادی کے باوجود فوجداری قانون کی پکڑ میں نہ آئے۔ (صفحہ ۵)

اسی نقطۂ نظر کی حمایت کرتے ہوئے دی ہندستان ٹائمس ۲۱ جون ۱۹۹۵ میں لیٹرس کے کالم میں مسٹر چمن لال ورما نے لکھا تھا کہ یکساں سول کوڈ کی ضرورت اس لیے ہے کہ ان لوگوں کو مذہب کے غلط استعمال سے روکا جا سکے جو ایک قانون کی دفعات سے بچنے کے لیے دوسرے قانون کی دفعات کا سہارا لیتے ہیں :

A uniform civil code is required to prevent the misuse of religion to evade the provisions of one law to take advantage of those of another.

نیا قانون بنانا کسی بھی درجہ میں پچھلے قانون کے غلط استعمال کے خلاف چیک نہیں۔ قانون کے غلط استعمال کا موقع ہر حال میں باقی رہتا ہے۔ ٹیکس ماری کو روکنے کے لیے بے شمار قوانین اور ضوابط بنے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود ٹیکس ماری کا سلسلہ ہالیائی سطح پر جاری ہے۔ پھر جب کسی بھی قانون میں اس کے غلط استعمال کو روکنا ممکن نہ ہو سکا تو سول کوڈ میں کیونکر ایسا ممکن ہو جائے گا۔

دوسری بات یہ کہ یونیفارم سول قانون کے نفاذ کے بغیر اگر ایسے ہندوؤں کے لیے کوئی قانونی چیک نہیں ہے تو سپریم کورٹ کے فاضل جج صاحبان کے لیے کیوں کر ایسا ممکن ہوا کہ وہ ایسے غلط ہندوؤں کے لیے سزا کا فیصلہ سنائیں اور ان کے دوسرے نکاح کو باطل (invalid) قرار دے دیں۔

سپریم کورٹ کے فیصلہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے جج صاحبان نے اپنا مقصد انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۴۹۴ کے ذریعہ حاصل کیا۔ گویا عدالت کی خود اپنی مثال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں بالفعل ایسے مانع قوانین موجود ہیں۔ اور کج رو ہندو کے لیے یہاں کوئی بے قید محرک پایا نہیں جاتا، حتیٰ کہ موجودہ قوانین کے تحت بھی نہیں۔ پھر ایسے کج رو لوگوں کو کج روی سے روکنے کے لیے کسی نئے سول قانون کی کیا ضرورت:

The Court's own ruling shows that no such inducement is available to an "errant Hindu" even under existing law. You do not need a civil code to deter him.

دفعہ ۴۴ قابل حذف

اوپر میں نے جو تجزیہ کیا ہے اور جو دلائل جمع کیے ہیں، اس کے بعد دو اور دو چار کی طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دستور ہند کی دفعہ ۴۴ کی کوئی بھی قانونی یا اخلاقی یا سماجی معنویت نہیں۔ وہ کچھ دماغوں کا ایک فرضی تخیل تھا۔ اب اس کا واحد انجام یہ ہونا چاہیے کہ اس کو دستور سے حذف کر دیا جائے، ٹھیک اسی طرح جس طرح جسم کی فاضل آنت (Appendix) کا آپریشن کر کے اسے نکال دیا جاتا ہے۔

اس قسم کا دستوری آپریشن کوئی نئی چیز نہیں۔ دستور ہند میں بار بار ایسے حذف و اضافے کیے جا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ابتدائی دستور میں انفرادی ملکیت کو مکمل طور پر محترم قرار دیا گیا تھا اور حکومت کو دستوری طور پر یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ کسی کی جائز ملکیت کو اس سے چھین سکے۔ مگر ۱۹۵۵ میں دستور میں چوتھا ترمیمی ایکٹ (The Constitution (Fourth Amendment) Act 1955)

منظور کیا گیا جس کی رو سے اسٹیٹ کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ کسی بھی شخص کی نجی ملکیت کو جبراً اپنے قبضہ میں لے لے۔ اس ایکٹ کی رو سے مالک جائداد کو اس حق سے بھی محروم کر دیا گیا کہ سرکاری معاوضہ اگر اس کو مارکٹ کی شرح سے کم معلوم ہو تو وہ عدالت میں اس کے خلاف استغاثہ دائر کر سکے۔

اسی طرح ابتدائی دستور میں سابق راجاؤں کو صَرف خاص (privy purses) کا حق دیا گیا تھا مگر ۱۹۷۱ میں دستور میں ۲۶ ویں ترمیم کی گئی جس کی رو سے اس دفعہ کا خاتمہ کر دیا گیا اور صَرف خاص کے سلسلہ میں ان کو دیے ہوئے تمام دستوری حقوق کو یکسر ساقط کر دیا گیا۔ وغیرہ۔

ان نظائر کی روشنی میں یہ بات کسی بھی درجہ میں انوکھی نہیں ہے کہ ایک اور ترمیم کے ذریعہ دستور ہند کی دفعہ ۴۴ کو کامل طور پر حذف کر دیا جائے۔ اس کا کچھ بھی نقصان نہیں ہوگا۔ البتہ ہمارا دستور ایک ایسے بوجھ سے ہلکا ہو جائے گا جو غیر ضروری طور پر اس کے اوپر لاد دیا گیا تھا۔

یونی کلچریشن یا ملٹی کلچریشن

ہندستان میں پچھلے سو سال سے دو مختلف سیاسی گروپ موجود رہے ہیں اور آج بھی وہ الگ الگ ناموں کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک وہ جو سیکولر آئیڈیالوجی پر ملک کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور دوسرا وہ جو ہندو آئیڈیالوجی پر ہندستانی سماج کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ہندستان میں تمام لوگوں کے لیے یکساں سول کوڈ بنایا جانا چاہیے۔

لیکن اگر غیر جانبدارانہ انداز سے دیکھا جائے تو یونیفارم سول کوڈ دونوں ہی کے نظریات کے خلاف ہے۔ اگر وہ اپنے نظریہ میں مخلص ہوں تو ہرگز انھیں اس قسم کے تصور کی حمایت نہیں کرنا چاہیے۔

سیکولرزم کا مطلب ہے ——— مذہب کے معاملہ میں اسٹیٹ کا عدم مداخلت (non-interference) کی پالیسی اختیار کرنا۔ لوگوں کو اپنے عقیدہ و مذہب کی آزادی دیتے ہوئے صرف مشترک دنیوی امور کا انتظام و انصرام کرنا۔ یہی سیکولرزم کا عالمی سطح پر متفقہ مفہوم ہے اور اسی مفہوم کے مطابق دستور ہند کی تشکیل کی گئی ہے۔

کچھ لوگ سیکولرزم کی تشریح اس طرح کرتے ہیں گویا کہ وہ خود ایک مذہب ہے اور تمام مروجہ مذاہب کو ختم کر کے نجی دائرہ سے لے کر اجتماعی دائرہ تک زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دائرہ میں لینا چاہتا ہے۔

مگر یہ انتہا پسندی ہے۔ اس قسم کے انتہا پسند لوگ ہر مذہب اور ہر نظام میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ خود اسلام میں ایسے انتہا پسند لوگ موجود ہیں جو اسلام کی ایسی تشریح کرتے ہیں، جس میں اسلام سیاست اور جنگ کا مذہب بن جاتا ہے۔ مگر یہ غلو اور تشدد ہے، وہ اسلام کی صحیح نمائندگی نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سیکولرزم اور یونیفارم سول کوڈ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہندستان کا سیکولر گروپ اگر واقعۃً سیکولر گروپ ہے تو اس کو یونیفارم سول کوڈ کی بات نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ انفرادی دائرہ میں مذہبی آزادی سیکولرزم کا بنیادی اصول ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو ہندو آئیڈیالوجی کی بنیاد پر کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ اس گروہ کو جاننا چاہیے کہ اگر وہ ہندو آئیڈیالوجی میں عقیدہ رکھتا ہے تو یہ خود اس کے اپنے عقیدہ کے خلاف ہوگا کہ وہ ہر طبقہ اور فرقہ کو ایک ہی سول کوڈ کے تحت لانے کی کوشش کرے۔

ہندو آئیڈیالوجی کا بنیادی اصول سرو دھرم سمبھاوا ہے۔ یعنی سب دھرم سچے ہیں۔ ہندوازم کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ کثرت میں وحدت (unity in diversity) کو مانتا ہے۔ اس کے نزدیک حقیقت کے ظاہری فارم مختلف ہوتے ہیں مگر اندرونی حقیقت ایک ہوتی ہے۔ گویا ہندوازم کا عقیدہ ہے ——— انیکتا میں ایکتا کو دیکھنا۔

سول کوڈ یا کسی بھی کوڈ کا تعلق ظاہری فارم سے ہے نہ کہ اندرونی اسپرٹ سے۔ ایسی حالت میں یہ ہندو نقطۂ نظر کے خلاف ہوگا کہ مختلف گروہوں کے پرسنل لا کو ختم کرکے سب کے لیے صرف ایک کوڈ جاری کرنے کی کوشش کی جائے۔

دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک (مثلاً برطانیہ، جرمنی، فرانس وغیرہ) میں ملٹی کلچرنیشن کا اصول رائج ہے۔ سنگاپور جیسے چھوٹے ملک سے لے کر امریکہ جیسے بڑے ملک تک ہر جگہ اسی اصول کو اختیار کرکے ترقی ہورہی ہے۔ سوویت یونین غالباً واحد ملک ہے جہاں یونی کلچرنیشن بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے لیے ہر قسم کی ریاستی طاقت استعمال کی گئی۔ مگر یونی کلچرنیشن تو نہیں بنی، البتہ خود سوویت یونین ٹوٹ کر ختم ہوگیا۔ تاریخ عالم کے یہ تجربات ہماری آنکھ کھولنے کے لیے کافی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں یکسانیت کا تعلق تاریخ سے ہے نہ کہ قانون سے۔ اگر کسی سماج میں تاریخی عمل کے ذریعہ یکساں کلچر آجائے تو وہاں یکساں کوڈ بھی بن جائے گا۔ اس سے پہلے ایسا ہونا ممکن نہیں۔

اضافۂ آبادی کا ہوّا

متعدد سینیر شہریوں نے یہ بات کہی ہے کہ شادی بیاہ کا معاملہ انتہائی نجی معاملہ ہے۔ اگر کوئی کمیونٹی چاہتی ہے کہ اس نجی معاملہ میں وہ اپنے روایتی طریقہ پر قائم رہے تو اس میں دوسری کمیونٹی والوں کو اعتراض کرنے کی کیا ضرورت۔ اس واضح نامعقولیت کے باوجود کچھ انتہا پسند پولیٹکل عناصر کیوں یونیفارم سول کوڈ لانے کے لیے اتنا زیادہ شور وغل کر رہے ہیں۔ حتی کہ انھوں نے اعلان کر دیا ہے کہ آنے والے لوک سبھا الکشن میں ان کا اصل انتخابی اشو (main poll theme) یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ ہوگا (دی ہندستان ٹائمس ۱۷ جولائی ۱۹۹۵) جب کہ یقینی طور پر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں یونیفارم سول کوڈ کی بنیاد پر قانون بنانے کا عملاً کوئی امکان نہیں۔ اس جوش وخروش کا سبب خود یونیفارم سول کوڈ کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے نام پر سیاسی فائدہ حاصل کرنے کا معاملہ ہے۔ یہ عناصر انتہائی سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت یہ غلط پروپگنڈا کر رہے ہیں کہ ہندستان میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اگلی صدی کے نصف اول میں یہ واقعہ ہونے والا ہے کہ مسلمان یہاں اکثریت میں ہو جائیں اور ہندو خود اپنے ملک میں اقلیت بن کر رہ جائیں۔

اس بے بنیاد پروپگنڈے کے لیے انھوں نے ایک پر فریب نظریہ وضع کیا ہے۔ وہ اکثریتی فرقہ کے عوام سے کہتے ہیں کہ دیکھو، آزادی کے بعد بننے والی گورنمنٹ نے ہندو میرج ایکٹ ۱۹۵۵ کے ذریعہ ہندوؤں کو تو قانونی طور پر پابند کر دیا کہ وہ صرف ایک بیوی رکھ سکتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کا جو پرسنل لا ایکٹ (۱۸۶۰) ہے، اس کے تحت ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ چار بیویاں رکھے۔ ہندو کے اوپر پابندی لگی ہوئی ہے، مگر مسلمان کے اوپر کوئی پابندی نہیں۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندو کے مقابلہ میں مسلمان چار گنا زیادہ بچے پیدا کر سکتا ہے۔ اس ملک میں ہندوؤں کی آبادی اگر ۱-۲-۳-۴-۵ کی رفتار سے بڑھے گی تو مسلمانوں کی تعداد ۱-۴-۸-۱۶-۳۲ کی رفتار سے بڑھتی چلی جائے گی۔ اپنے سیاسی حریف کی اس طرح بھیانک تصویر دکھا کر یہ لوگ ہندوؤں میں اپنا ووٹ بینک بنا رہے ہیں۔ وہ ہندو عوام سے کہہ رہے ہیں کہ اس ہندو ورودھی سرکار کے خلاف ووٹ دے کر اس کو باہر پھینک دو:

Throw out this anit-Hindu government.

یہ پروپگنڈا بلاشبہ آخری حد تک بے بنیاد ہے۔ مسلمان عام طور پر ایک ہی شادی کرتے ہیں۔ میری

عمر ۳۰، سال ہو چکی ہے۔ مگر اس پوری مدت میں میرے علم میں کوئی ایک بھی ہندستانی مسلمان نہیں آیا جس نے چار شادیاں کر رکھی ہوں۔ حتی کہ ایسا کرنا ممکن بھی نہیں۔ کیوں کہ تمام مسلمان چار شادیاں اس وقت کر سکتے ہیں جب کہ ان کے یہاں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد چار گنا زیادہ ہو۔ یا ان کے پاس کوئی ایسا کارخانہ ہو جہاں وہ زیادہ عورتیں پیدا کر سکیں۔ مگر موجودہ مسلم سماج میں نہ تو عورتیں زیادہ ہیں اور نہ مسلمانوں کے پاس کوئی عورت ساز فیکٹری موجود ہے۔ ایسی حالت میں ان کے لیے کیوں کر ممکن ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص چار چار بیویاں رکھے۔ مسٹر بلراج پوری کا ایک پیراگراف اس سلسلہ میں نقل کرنے کے قابل ہے :

" اس خدشہ کا پہلا مقدمہ کہ تعدد ازواج کے حق میں قانونی دفعہ اس پر عمل تک بھی پہنچائے گی، شماریاتی مطالعہ سے ثابت نہیں ہوتا۔ عورت کی حیثیت کے بارہ میں نیشنل کمیشن کی رپورٹ کے مطابق، تعدد ازواج فی الحقیقت دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے اندر کم ہے۔ اس کا دوسرا مقدمہ کہ تعدد ازواج مسلمانوں کی آبادی کو زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھائے گا، منطقی طور پر مغالطہ آمیز ہے۔ بچہ پیدا کرنے کے قابل عورتوں کی تعداد چونکہ ہمیشہ یکساں رہتی ہے، اگر کچھ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کریں تو بہت سے مردوں کو بیویاں ہی نہیں ملیں گی۔ کسی فرقہ میں غیر شادی شدہ مردوں کی کثیر تعداد کسی بھی طرح اس فرقہ کی تولیدی صلاحیت میں اضافہ نہیں کرتی۔ واضح طور پر، چار آدمی چار بیویوں کے ساتھ زیادہ بچے پیدا کریں گے، بمقابلہ اس کے کہ ایک ہی مرد کے ساتھ چار بیویاں ہوں۔ اس طرح تعدد ازواج کا طریقہ آبادی میں اضافہ کی رفتار کو گھٹانے والا ہے نہ کہ اس کو بڑھانے والا (انڈین اکسپرس ۶ جولائی ۱۹۹۵)

تقریباً یقینی ہے کہ مذکورہ انتہا پسند سیاسی عناصر اگلے الکشن میں ہندو ووٹروں سے کہیں گے کہ دیکھو، دستور کی دفعہ اور سپریم کورٹ کے فیصلہ کے باوجود مسلمان یکساں سول کوڈ بنانے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ وہ ایسا قانون بنانے کے مخالف اس لیے ہیں کہ اس کے بعد انھیں چار شادیوں کی اجازت نہیں رہے گی اور اس طرح وہ اپنی آبادی بڑھانے اور ہندوؤں کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے بارہ میں اپنے منصوبہ کی تکمیل نہ کر سکیں گے۔ اس لیے ہمیں ووٹ دے کر ہم کو اقتدار تک پہنچاؤ تاکہ ہم اس خطرہ کا دفیعہ کر سکیں۔ مگر اس پروپگنڈے کا بے بنیاد ہونا ہی اس کے لیے کافی ہے کہ خدا کی دنیا میں وہ کامیاب نہ ہو۔ ملک کا سب سے بڑا اخبار ٹائمس آف انڈیا ہر روز اپنے پہلے صفحہ پر اس قانون فطرت کا اعلان کرتا ہے کہ سچائی غالب آتی ہے (Let Truth Prevail)

مساوات نہیں ایڈجسٹمنٹ

۱۹۵۴ میں ہندستانی پارلیمنٹ نے اسپیشل میرج ایکٹ منظور کیا تھا۔ اس کے مطابق، مرد اور عورت کسی مذہبی رسم کی ادائگی کے بغیر مخصوص کورٹ میں جاتے ہیں اور ایک مجسٹریٹ کے سامنے اقرار کرکے ایک دوسرے کے قانونی میاں اور بیوی بن جاتے ہیں۔ کامن سول کوڈ اگر سیکولر اصول پر بنایا جائے تو وہ موجودہ اسپیشل میرج ایکٹ ہی کی ایک توسیع ہوگی۔ میں نے دہلی میں تحقیق کی کہ یہاں کتنے لوگ ہیں جنھوں مذکورہ ایکٹ کے تحت اپنی شادی کی ہے۔ کافی تلاش و تحقیق کے بعد مجھے صرف دو آدمی ملے۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ یہ دونوں کسی مذہبی رسم کے بغیر سادہ طور پر کورٹ میں گئے اور وہاں اپنا نکاح رجسٹر کرالیا۔ مگر چند ہی سال کے بعد دونوں شادیاں ٹوٹ گئیں اور اب مرد و عورت دونوں الگ الگ رہتے ہیں۔ میں نے مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس علٰحدگی کا سبب "ایگوازم" تھا۔ دونوں میں اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر تکرار ہوجاتی۔ یہ تکرار بڑھتے بڑھتے مستقل علٰحدگی تک پہنچ گئی۔

مساوات مرد و زن کا جدید نظریہ کاغذ پر بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر زندگی میں سب سے زیادہ جس چیز کی اہمیت ہے وہ ایڈجسٹمنٹ ہے نہ کہ مساوات۔ مساوات کا تصور حقوق طلبی کا مزاج بناتا ہے اور ایڈجسٹمنٹ کا تصور حقوق کی ادائگی کا۔ یہی وجہ ہے کہ مساواتی ذہن کے مرد و عورت اکثر لڑکر ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں، اور ایڈجسٹمنٹ کا ذہن رکھنے والے کامیاب گھر کی تعمیر کرتے ہیں۔

میں نے جاپان کے بارہ میں ایک کتاب پڑھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ جاپانی عورت اور مرد کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ میں کسی کے ماتحت ہوں (I am under someone) اپنے اس احساس کی بنا پر جاپانی انسان ہمیشہ فریق ثانی سے ایڈجسٹ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکی عورت سب سے زیادہ بری بیوی ہے اور جاپانی عورت سب سے زیادہ اچھی بیوی۔ اس کا راز یہی ہے۔ امریکی عورت پر سب سے زیادہ جو خیال مسلط ہوتا ہے وہ برابری کا تصور ہے۔ اس کے برعکس جاپانی عورت برابری اور نابرابری کی بحث سے اوپر اٹھ کر صرف یہ احساس لیے ہوتی ہے کہ مجھے موافقت کے اصول پر زندگی گزارنا ہے۔ اسی لیے ازدواجی زندگی میں امریکی عورت ناکام رہتی ہے اور جاپانی عورت کامیاب ——— اچھا خاندان بنانے کے لیے ہمیں سب سے زیادہ ایڈجسٹمنٹ پر زور دینا ہے نہ کہ مغربی تصور کے مطابق مساوات پر۔

ہندو برادریوں کا رواج

خود ہندوؤں میں شادی بیاہ کا کوئی ایک مقرر طریقہ نہیں۔ ہندوؤں میں سیکڑوں کی تعداد میں مختلف گروہ ہیں، اور ہر گروہ اپنے اپنے خاندانی یا علاقائی رواج کے مطابق شادی کی رسوم ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کرکٹ کے مشہور کھلاڑی سا چن ٹنڈولکر (Sachin Tendulkar) نے ۲۵ مئی ۱۹۹۵ کو بمبئی میں مسز انجلی مہتا سے شادی کی تو اخباری رپورٹ کے مطابق، ان کے نکاح کی تقریب مہاراشٹر کے روایتی انداز (traditional Maharashtrian-style) میں ادا کی گئی (پانیر ۲۶ مئی ۱۹۹۵)

آج بھی تقریباً تمام ہندو اپنی شادیاں اپنے مذہبی رواج کے مطابق کرتے ہیں، اگرچہ اسپشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ کی صورت میں ان کے لیے ایک عمومی قانون موجود ہے :

Almost all Hindus still solemnise their marriages through religious customs although there is a civil way out through the Special Marriages Act of 1954. (The Hindustan Times, May 22, 1995)

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں۔ یہ دراصل وہی ہے جو ہونا چاہیے۔ شادی بیاہ کا تعلق انتہائی نجی معاملات سے ہے۔ ایسے معاملات میں ہر فرقہ ہمیشہ اپنے خاندانی یا گروہی رسم و رواج کے مطابق ہی عمل کرتا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن نہیں۔

اصل ضرورت : نیشنل کیرکٹر

انڈیا کو ایک متحد اور پرامن اور ترقی یافتہ ملک بنانے کے لیے اصل میں جس چیز کی ضرورت ہے، وہ نیشنل کیرکٹر ہے۔ ملک میں جتنی بھی کمیاں ہیں، یا جو بگاڑ بھی یہاں نظر آتا ہے۔ ان سب کا اصل سبب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آزادی کے بعد ملک کے لوگوں میں نیشنل کیرکٹر پیدا نہ کیا جا سکا۔

نیشنل سوچ شخصی سوچ کی ضد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ذاتی مفاد کو اہمیت دینے کے بجائے قومی مفاد کو اہمیت دے۔ جہاں کہیں دونوں تقاضوں میں ٹکراؤ ہو تو وہ شخصی مفاد کو پس پشت ڈال دے اور قومی مفاد والے طریقہ کو اختیار کرلے۔

باہر کا کوئی ملک پیسہ دے کر آپ کو خریدنا چاہے تو اپنے ملک کی محبت آپ کو اس سے روک دے۔ ٹیکس نہ دینے میں آپ کو ذاتی فائدہ ہو رہا ہو تب بھی آپ ٹیکس دیں کیوں کہ اس سے قوم کو فائدہ

ہوگا۔ ملاوٹی چیزیں سپلائی کرنے میں آپ کا ذاتی نفع بڑھتا ہو مگر آپ ایسا نہ کریں، کیوں کہ ایسا کرنے سے ملک کی ترقی رک جاتی ہے۔ ذاتی شکایت کے باوجود آپ قومی املاک کو نقصان نہ پہنچائیں اور اقتصادی پہیہ کو روکنے کی کوشش نہ کریں، کیوں کہ اس میں ملک کی تباہی ہے۔ الکشن میں اگر آپ ہار جائیں تو دل سے اپنی ہار کو مان لیں۔ کیوں کہ ہار نہ ماننے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کا پورا سیاسی نظام بگڑ جاتا ہے۔ اگر آپ ذمہ داری کے عہدہ پر ہیں تو اپنے مالی فائدہ کے لیے سکینڈل اور اسکیم میں ملوث نہ ہوں، کیوں کہ ایسا کرنے سے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو ایک بار حکومت مل جائے تو یہ نہ چاہیں کہ میں ہی ہمیشہ حکومت کی گدی پر بیٹھا رہا ہوں۔ کیوں کہ اس قسم کی سیاسی خودغرضی ملک کے جمہوری ڈھانچہ کو تباہی اور بربادی کے آخری کنارے پہنچا دیتی ہے۔ اگر آپ لیڈر ہیں تو اپنے الکشنی مفاد کے لیے ایک گروہ کے اندر دوسرے گروہ کے خلاف نفرت اور خوف کے جذبات نہ پیدا کریں۔ کیوں کہ اس سے آپ کا ووٹ بنک تو بنے گا۔ لیکن ملک کا بینک دیوالیہ ہو کر رہ جائے گا۔ وغیرہ

اسی کا نام سچی دیش بھگتی ہے۔ اور یہی ملک کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہے۔ مگر یہی چیز آج ہمارے ملک میں موجود نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے لوگ دیش بھگت کے بجائے خویش بھگت ہو گئے ہیں۔ ہر ایک اپنے فائدہ کی خاطر ملک کے فائدہ کو بھول گیا ہے۔ اسی خویش بھگتی نے ملک کا وہ برا حال کر دیا ہے جس کی آج ہر آدمی شکایت کر رہا ہے۔

دیش بھگتی کا مسئلہ کوڈ جیسی ظاہری کارروائیوں سے کبھی نہیں آئے گی۔ بلکہ لوگوں کی سوچ کو تعمیری رخ دینے سے آئے گی۔ اس کے لیے ہمیں تمام ذرائع کو استعمال کر کے لوگوں کو ایجوکیٹ کرنا ہوگا۔ ہمیں تعمیر شعور یا ذہنی بیداری کی ایک طویل اور ہمہ گیر مہم چلانی ہوگی۔ یہ بلاشبہ ایک مشکل کام ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی دوسری چیز اس کا بدل نہیں۔

تعلیم کی اہمیت

دستور ہند کے رہنما اصولوں کے تحت جو دفعات درج ہیں ان میں سے ایک اس کی دفعہ ۴۵ ہے۔ یہ دفعہ کہتی ہے کہ ریاست یہ کوشش کرے گی کہ دستور کے نفاذ کے بعد دس سال کی مدت میں وہ تمام بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم فراہم کر دے یہاں تک کہ وہ چودہ سال کی عمر تک پہنچ جائیں :

The state shall endeavour to provide, within a period of ten years from the commencement of this Constitution, for free and compulsory education for all children untill they complete the age of fourteen years.

غالباً بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ دفعہ دستور کے رہنما اصولوں کے تحت درج شدہ دفعات میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی یہی دفعہ سب سے زیادہ غیر اہم بنی ہوئی ہے۔ سپریم کورٹ نے کبھی اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ حکومت سے باز پرس کرے کہ دس سال کی مقرر مدت گزرنے کے باوجود اس دفعہ پر عمل کیوں نہیں کیا گیا۔

دستور ہند کا نفاذ ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ کو ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نومبر ۱۹۵۹ میں دس سال کی یہ مقرر مدت پوری ہو گئی۔ مگر ملک کے تمام نوجوانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا نشانہ کسی بھی درجہ میں حاصل نہ ہو سکا۔

تعلیم کی اہمیت قومی تعمیر کے لیے اتنی زیادہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں کامن سول کوڈ کا معاملہ صرف ایک نان اشو کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا واحد ٹارگٹ نشانہ صرف یہ ہونا چاہیے کہ ہم ملک کی آبادی کو صد فی صد تعلیم یافتہ بنائیں۔ اس کے سوا جس چیز کو بھی نشانہ بنایا جائے گا وہ اصل قابل لحاظ چیز سے توجہ کو ہٹانے (shift of emphasis) کے ہم معنی ہوگا۔ اور اس طرح توجہ کو اہم سے ہٹا کر غیر اہم میں الجھا دینا ایک قومی جرم ہے نہ کہ قومی خدمت۔

تعلیم کا تعلق اصلاً سروس سے نہیں ہے۔ تعلیم کی اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ شعور کی تربیت کرتی ہے۔ وہ آدمی کو صحیح طرز پر سوچنے والا بنا دیتی ہے۔ سماج یا قوم میں جتنے بھی مثبت اور مفید واقعات ہوتے ہیں وہ سب انھیں لوگوں کی دین ہوتے ہیں جو صحیح طرز فکر کے حامل ہوں۔

صحیح طرز فکر آدمی کے اندر دور اندیشی پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کو بتاتا ہے کہ وہ اختلافات سے کس طرح نپٹے۔ وہ آدمی کے اندر وہ بالغ نظری پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے مائنس کو پلس میں تبدیل کر سکے۔ اس سے آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کو جانتا ہے۔ وہ ظاہر سے گزر کر اندرونی حقیقت کو دریافت کر لیتا ہے۔ صحیح طرز فکر سے صحیح عمل ظہور میں آتا ہے، اور صحیح عمل ہی کسی فرد یا گروہ کو کامیابی کی منزل تک پہنچاتا ہے۔

سماج میں یک جہتی اور اتحاد کی فضا بنانے کے لیے اصل ضرورت یہ نہیں ہے کہ لوگوں کا

شادی بیاہ کا طریقہ ایک ہو۔ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ لوگ صحیح طرز فکر کے حامل ہوں۔ صحیح طرز فکر کیا ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوگا۔

سوامی ویویکانند (۱۹۰۲-۱۸۶۳) کو ایک کرسچین بھائی نے اپنے مکان پر بلایا۔ کرسچین نے سوامی جی کو جانچنے کے لیے یہ کیا کہ اپنے ملاقات کے کمرہ میں ایک میز پر نیچے اور اوپر بہت سی مذہبی کتابیں رکھ دیں۔ سب سے نیچے ہندوؤں کی مقدس کتاب رامائن رکھی۔ اس کے اوپر مختلف مذہبوں کی کتابیں، اور سب سے اوپر اپنی مذہبی کتاب بائبل۔ سوامی ویویکانند جب کمرہ میں داخل ہوئے تو کرسچین میزبان نے کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھئے، اس کے بارہ میں آپ کا تبصرہ کیا ہے۔ سوامی جی کتابوں کی مذکورہ ترتیب کو دیکھ کر مسکرائے، اور کہا: فاؤنڈیشن تو بہت اچھی ہے۔

سوامی جی اگر اس معاملہ کو وقار (پرسٹیج) کا اشو بناتے تو وہ بگڑ جاتے۔ وہ کہتے کہ کیا تم نے مجھے ذلیل کرنے کے لیے یہاں بلایا تھا۔ اب دونوں میں تکرار شروع ہوجاتی۔ عین ممکن ہے کہ یہ تکرار بڑھ کر اس نوبت تک پہنچتی کہ امن قائم کرنے کے لیے پولیس کو بلانا پڑتا۔ لیکن سوامی جی نے اس کو وقار کا مسئلہ بنانے کے بجائے اس کو اعراض کا مسئلہ بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو معاملہ دونوں کو لڑائی تک پہنچاتا، وہ دونوں کے درمیان مسکراہٹ کے تبادلہ پر ختم ہوگیا۔

یہ قابل قدر واقعہ کیوں کر پیش آیا۔ کیا اس لیے کہ سوامی ویویکانند اور مذکورہ کرسچین کا شادی بیاہ کا طریقہ ایک تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ کیوں کہ ان میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا عیسائی۔ اور ہندوؤں اور عیسائیوں میں شادی بیاہ کا طریقہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ سوامی ویویکانند ایک ایسے آدمی تھے جن کی اعلیٰ تعلیم نے ان کو حد درجہ باشعور بنا دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کس طرح کسی واقعہ کو منفی رخ دینے کے بجائے اس کو مثبت رخ دیا جاسکتا ہے۔ وہ سوچنے کا آرٹ جانتے تھے۔ وہ زندگی کی سائنس سے واقفیت رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کس طرح اختلاف کے باوجود اتحاد کے ساتھ رہا جاسکتا ہے۔ اس کا راز سوامی جی کی شعوری بیداری تھا نہ کہ کسی قسم کا مشترک سول کوڈ۔

مسلمانوں سے خطاب

آخر میں مسلمانوں سے میں گزارش کروں گا کہ وہ سپریم کورٹ کے موجودہ فیصلہ (۱۹۹۵) کے معاملہ میں ماضی کی اس غلطی کو ہرگز نہ دہرائیں جو سپریم کورٹ کے سابق فیصلہ (۱۹۸۵) کے معاملہ میں ان سے سرزد ہوئی تھی۔ دس سال پہلے جب شاہ بانو کیس پر عدالت عالیہ کا فیصلہ سامنے آیا تو مسلمانوں نے سارے ملک میں احتجاج اور مظاہرہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کا براہ راست فائدہ ملک کے انتہا پسند ہندو عناصر کو پہنچا۔

اب دوبارہ یہ عناصر انتظار کر رہے ہیں کہ مسلمان مشتعل ہو کر سڑکوں پر آجائیں، تاکہ وہ مسلم خطرہ کا ہوّا کھڑا کر کے ہندوؤں میں اپنا ووٹ بینک بنا سکیں۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ اپنی موجودہ حالت میں مسلمانوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ البتہ اگر مسلمانوں نے دوبارہ مظاہراتی طریقے اختیار کیے تو یقینی طور پر وہ ان کے لیے خطرہ بن جائے گا۔

یہ دنیا مقابلہ اور مسابقت کی جگہ ہے۔ یہاں ہر ایک اس انتظار میں رہتا ہے کہ وہ دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔ فریق ثانی کو یہ موقع ہمیشہ اس وقت ملتا ہے جب کہ ناخوش گوار صورت حال پیش آنے پر آپ بھڑک اٹھیں اور عاجلانہ اقدام کر بیٹھیں۔ اسی لیے قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ ـــــ تم صبر کرو، جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا، اور ان کے لیے جلدی نہ کرو (الاحقاف ۳۵) صبر کا طریقہ فریق ثانی سے یہ موقع چھین لیتا ہے کہ وہ آپ کی کمزوریوں کا استحصال کر سکے۔ جب کہ بے صبری کا طریقہ آپ سے ایسی غلطیاں کراتا ہے کہ آپ نہایت آسانی سے فریق ثانی کے سازشی منصوبوں کا شکار ہو جائیں۔

کسی فریق کے خلاف سازش اگرچہ دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ مگر عملاً سازش کا شکار ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ خود فریق کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو سمجھنے میں زیر سازش گروہ کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

باب چہارم

تعمیر کا عمل فطرت خداوندی سے مطابقت کا عمل ہے۔ اس دنیا میں وہی منصوبہ بندی کامیاب ہوتی ہے جو خدا کے قائم کردہ نظام سے ہم آہنگی کی بنیاد پر قائم کی جائے۔

اصلاح کی طرف

پروفیسر ہیرن مکرجی ایک فریڈم فائٹر ہیں۔ وہ جواہر لال نہرو (۱۹۶۴-۱۸۸۹) کے زمانہ میں ہندستانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ پروفیسر ہیرن مکرجی ایک بار پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی آئے۔ اجلاس سے فارغ ہو کر جب وہ دہلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے تو ان پر ایک تجربہ گزرا۔ کلکتہ واپس پہونچ کر انھوں نے سابق وزیر اعظم ہند، جواہر لال نہرو کے نام ایک خط لکھا جس میں اس تجربہ کا ذکر تھا۔

پروفیسر مکرجی نے لکھا کہ میری ٹرین جب نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے کنارے بہت دور تک جھگی جھونپڑی کی قطاریں چلی جارہی ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ان جھونپڑیوں میں رہنے والے غریب ہندستانی اگر مجھ سے پوچھیں کہ ملک کی آزادی سے ہم کو کیا ملا تو میں ان کو کیا جواب دوں گا۔ جواہر لال نہرو نے اس کے جواب میں پروفیسر مکرجی کو جو خط لکھا اس کا ایک جملہ یہ تھا:

You are paying the price of being sensitive.

(تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو) راقم الحروف کو یہ پسند نہیں کہ ہم حساس نہ ہوں۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ہم حساس ہوں تاکہ ہم تڑپیں۔ تاکہ ہم ملک کے حالات کے بارہ میں زیادہ سنجیدہ ہوں، تاکہ ہم اس کے متعلق زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچیں۔ اور ملک کو بہتر مستقبل کی طرف لے جانے کی فکر کریں۔

آپ جانتے ہیں کہ نئے ہندستان کا آغاز ۱۹۴۷ سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یہ ملک یورپی قوموں کے سیاسی اور اقتصادی استحصال کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ مہاتما گاندھی (۱۹۴۸-۱۸۶۹) نے ہندستان کو سیاسی بنیاد (Political base) عطا کی۔ اس کے بعد جواہر لال نہرو (۱۹۶۴-۱۸۸۹) نئے ہندستان کے وزیر اعظم ہوئے اور انھوں نے ملک کے لیے صنعتی بنیاد (Industrial base) فراہم کی۔

اس سے پہلے ہندستان کی جو حالت تھی اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حکومتی فیصلہ کی قوت

ملکی باشندوں کے ہاتھ میں نہ ہونے کی وجہ سے سڑکوں کی ترقی کا کام بہت دیر سے شروع ہو سکا
ہندستان میں ریلوے کا آغاز برٹش دور میں ۱۸۵۳ میں ہوا۔ اور بہت جلد سارے ملک
میں ریلوے لائن کا جال بچھا دیا گیا۔ مگر سڑکوں کی ترقی ۰۷ سال تک رکی رہی۔ ملک میں
سڑکوں کی تعمیر حکومت کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں :

> Little attention was paid to road development until the 1920s, mainly because the government had previously focussed its attention on railways (9/295).

۱۹۲۰ کے بعد کے سالوں سے پہلے روڈ کی ترقی پر بہت کم توجہ دی جا سکی۔ خاص طور پر اس
وجہ سے کہ (برطانی) حکومت نے اس سے پہلے اپنی ساری توجہ ریلوے پر لگا رکھی تھی۔
برطانی حکومت ریل کی پٹریوں کو لوہے کی زنجیریں سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ان
زنجیروں کے ذریعہ وہ ملک پر اپنے قبضہ کو زیادہ دیر تک باقی رکھ سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ
اس نے ریلوے لائنیں بچھانے پر خصوصی توجہ دی۔ مگر سڑکیں بنانے پر وہ توجہ نہ دے سکی۔
ملک کو سیاسی غلامی کی یہ قیمت دینی پڑی کہ سڑکوں کی تعمیر کے معاملہ میں وہ پیچھے ہو گیا جو
کہ قومی ترقی کے لیے موجودہ زمانہ میں نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔
دوسری مثال صنعت کی ہے۔ ہندستان میں اکثر معدنی ذخیرے (Mineral resources)
افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ یہاں صنعتی ایندھن (کوئلہ) بھی بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے۔
دنیا کے لوہے (Iron-ore) کے ذخائر کا ½ حصہ صرف ہندستان کی زمین کے نیچے موجود
ہے۔ اس کے باوجود ملک کی آزادی سے پہلے اس کی صنعتی ترقی ممکن نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ
یہ تھی کہ اس سے پہلے یہاں ایک بیرونی قوم کا قبضہ تھا۔ وہ ہندستان کو اپنی صنعتی سامانوں
کی منڈی بنائے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۷ میں جب ہندستان آزاد ہوا تو اس کے بعد یہاں باہر کا
سامان درآمد کرنے پر پابندیاں لگائی گئیں۔ اور ملکی صنعت کو ترقی کے مواقع دیئے گیے۔
چنانچہ ہندستان تیزی سے صنعتی میدان میں آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ اب وہ صنعتی طور پر
ترقی یافتہ ملکوں میں شمار کیا جانے لگا ہے۔
یہ ایک حقیقت ہے کہ سیاسی اور صنعتی اعتبار سے ملک اب ترقی کے اگلے اسٹیج پر

پہونچ رہا ہے۔ ہندستان کی سیاسی بنیاد اب اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ وہ "تیسری دنیا" کے ملکوں کی قیادت کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ اسی طرح ہندستان کی صنعتی بنیاد اب اتنی گہری ہو چکی ہے کہ ۱۹۸۵ سے اس نے الکٹرانک دور میں داخلہ کا آغاز کر دیا ہے۔ پہلے ہندستان کو یہ ڈر رہتا تھا کہ امپورٹ کا راستہ کھولنے سے اس کی اندرونی صنعت برباد ہو جائے گی۔ اور اب ملک کو اس حد تک اعتماد پیدا ہو چکا ہے کہ وہ امپورٹ کی پابندیاں کم کرنے کے بعد بھی یہ اعتماد رکھتا ہے کہ وہ بیرونی صنعتوں کا مقابلہ کر کے آگے بڑھ سکتا ہے۔

یہ باتیں بلاشبہ اچھی ہیں۔ یہ ہر ہندستانی کے لیے خوشی کا باعث ہیں کہ پچھلے ۴۰ سال میں ملک نے سیاسی اور صنعتی بنیاد حاصل کر لی۔ مگر ہندستان کی حقیقی ترقی کے لیے ابھی ایک اور مشکل ترمرحلہ باقی ہے۔ اور وہ یہ کہ ملک کو اخلاقی بنیاد (Moral base) عطا کی جائے۔ اخلاقی بنیاد فراہم کرنے کا مسئلہ فیصلہ کن حد تک اہم ہے۔ اگر یہ بنیاد فراہم نہ ہو تو بقیہ میدانوں کی ترقیاں بھی غیر موثر ہو کر رہ جائیں گی۔

یہاں ہم سابق وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک اقتباس نقل کریں گے۔ انھوں نے اپنے سوانح نگار مائیکل بریچر کو انٹرویو دیتے ہوئے ۱۹۵۶ میں کہا تھا :

What constitutes a good society? I believe in certain standards. Call them moral standards. They are important in any individual and in any social group. And if they fade away, I think that all the material advancement you may have will lead to nothing worthwhile. How to maintain them, I can't know.

Nehru, *A Political Biography*, By Michael Brecher, p. 607

وہ کیا چیز ہے جو ایک اچھا سماج بناتی ہے۔ میں کچھ متعین معیاروں میں عقیدہ رکھتا ہوں۔ آپ ان کو اخلاقی معیار کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہر شخص اور ہر سماجی گروہ کے لیے اہم ہیں۔ اور اگر وہ باقی نہ رہیں تو میرا خیال ہے کہ آپ نے جو بھی مادی ترقی حاصل کی ہو وہ بے قیمت ہو کر رہ جائے گی۔ اس اخلاقی معیار کو کس طرح حاصل کیا جائے، اس کا جواب مجھے نہیں معلوم۔

ہندستان کے موجودہ وزیر اعظم کی ایک تقریر اخبارات میں حسب ذیل الفاظ میں

آئی ہے :

Prime Minister Rajiv Gandhi today said building factories and dams was useless if the quality of human beings was not good.
***The Hindustan Times*, September 12, 1986.**

وزیر اعظم راجیو گاندھی نے کہا کہ کارخانے اور بند بنانا بے فائدہ ہے اگر انسانوں کے اندر اچھی خصوصیات نہ ہوں۔

مثلاً ملک میں بجلی اور زراعت کی ترقی کے لیے ہمیں ایک ڈیم بنانا ہے۔ اب ایک ضرورت یہ ہے کہ ملک آزاد ہو تاکہ وہ کسی خارجی دباؤ کے بغیر خود اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کر سکے۔ یہ ضرورت ملک کی سیاسی آزادی سے پوری ہو جائے گی۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کی تعمیر کے لیے ضروری ٹکنالوجی موجود ہو۔ یہ ضرورت ہمارے وہ ٹکنکل ماہرین پوری کر دیں گے جو انجینیرنگ کالجوں سے ڈگری لے کر نکل رہے ہیں۔

مگر اچھے ڈیم کی تیاری کے لیے صرف یہی دو چیزیں کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ ایک تیسری چیز بھی ہے جو لازمی طور پر ضروری ہے، اور وہ ہے دیانت داری (Honesty) اگر کام کرنے والے افراد کے اندر دیانت داری کا مادہ نہ ہو تو سیاسی آزادی اور ٹکنکل قابلیت کے باوجود وہ ڈیم تیار نہ ہو سکے گا جو فی الواقع ملک کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

دیانت داری نہ ہونے کی صورت میں یہ ہوگا کہ حکومت عوام سے ٹیکس وصول کرکے ایک ارب روپیہ ٹھیکہ داروں اور انجینیروں اور افسروں کے ہاتھ میں دے گی۔ مگر وہ روپیہ کا ایک حصہ اپنی جیب میں رکھنے کی خاطر یہ کریں گے کہ وہ غیر معیاری لوہا استعمال کریں گے۔ وہ ریت اور سمنٹ کا تناسب غلط کر دیں گے۔ وہ پیسہ بچانے کے لیے ہر چیز میں کمی کرتے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بظاہر ڈیم تو بن کر تیار ہو جائے گا۔ مگر لوہے اور سمنٹ (RCC) کی تعمیر کے باوجود وہ مضبوط نہ ہوگا۔ بے پناہ خرچ اور سالوں کی منصوبہ بندی کے بعد اُدھر ڈیم بن کر کھڑا ہوگا اور اِدھر خبریں آنے لگیں گی کہ اس کا فلاں حصہ ٹوٹ گیا ہے۔ اس کے فلاں حصہ میں شگاف ہو گیا ہے۔ بے پناہ خرچ کے بعد ایک پُل بن کر کھڑا ہوگا اور اگلے سال خبر ملے گی کہ وہ ٹوٹ کر گر پڑا۔

اس مہلک انجام سے بچنے کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ملک میں جس طرح سیاسی انقلاب اور صنعتی انقلاب برپا کیا گیا ہے، اسی طرح ملک میں ایک اخلاقی انقلاب برپا کیا جائے۔ ملک کو جس طرح سیاسی بنیاد اور صنعتی بنیاد فراہم کی گئی ہے اسی طرح اس کے لیے اخلاقی بنیاد بھی فراہم کی جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اخلاقی بنیاد کیا ہے اور اس کو ہم کس طرح ملک کے حق میں تعمیر کر سکتے ہیں۔

اخلاقیات (یا مارل فلاسفی) پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اب وہ ایک پیچیدہ فن بن گیا ہے مگر اس کی فنی تفصیلات اور اخلاقی فلاسفہ کے اختلافات سے قطع نظر، یہاں میں صرف اس کے سادہ عملی پہلو کو بیان کروں گا۔ جو کہ اخلاق کے معاملہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

اخلاق کا خلاصہ انسانیت کا احترام ہے۔ دوسرے افراد یا گردوپیش کے انسانی معاشرہ کی نسبت سے آدمی کے اوپر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، خواہ باضابطہ طور پر ان کے بارہ میں قول وقرار ہوا ہو، یا باضابطہ قول وقرار نہ ہوا ہو، ہر حال میں ان کو ادا کرنا ضروری ہے۔ اور اسی ادائیگی کا نام اخلاق ہے۔

اس تعریف کے مطابق اخلاق ہر آدمی کی جانی پہچانی اور معلوم چیز ہے۔ ہر آدمی فطری طور پر حق اور ناحق کی پہچان رکھتا ہے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ دوسروں سے معاملہ کرتے ہوئے اس کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اخلاق یہ ہے کہ آدمی اپنی اسی جانی ہوئی چیز پر عمل کرنے لگے۔

اسی بنا پر اخلاقیات کے لیے قرآن وحدیث میں معروف اور منکر کے الفاظ استعمال کیے گیے ہیں۔ اسلام کی نظر میں پسندیدہ اخلاق "معروف" ہے اور ناپسندیدہ اخلاق "منکر"۔ معروف کے معنی ہیں جانی پہچانی چیز، اور منکر کے معنی ہیں اجنبی چیز۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو اچھا قرار دیا ہے وہ وہی چیزیں ہیں جن کے اچھا ہونے کا شعور خود انسانی فطرت میں پیوست ہے۔ اسی طرح جن چیزوں کو الٰہی شریعت میں برا قرار دیا گیا ہے وہ وہی چیزیں ہیں جن کو انسانی فطرت پیشگی طور پر برا سمجھتی ہے۔

تاہم معروف ومنکر کے یہ احساسات انسانی فطرت میں وجدانی طور پر پیوست ہیں نہ کہ اس طرح لکھے ہوئے ہیں جس طرح کاغذ کے صفحہ پر کوئی چیز لکھی جاتی ہے۔ الٰہی شریعت یہاں یہ کرتی ہے کہ وہ معروف ومنکر کے احساسات کو الفاظ کی شکل دے دیتی ہے۔ وہ محسوس چیز کو ملفوظ چیز بنا دیتی ہے۔

حدیث میں اخلاق کی نہایت سادہ پہچان بتائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ تم دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو سلوک تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ ہر آدمی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دوسروں کو اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے، بس اسی کو وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ کرنے لگے۔ جس آدمی کے اندر یہ صفت آجائے وہ بااخلاق آدمی ہو گیا۔ اخلاق، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں کہ جو کچھ ہم اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی ہم دوسروں کے لیے بھی پسند کرنے لگیں۔

اخلاق کے اس قدر معلوم اور معروف ہونے کے باوجود اخلاق ہی وہ چیز ہے جو لوگوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاق کی ایک قیمت ہے اور اسی قیمت نے اس کے خریداروں کو اس سے دور کر رکھا ہے۔ لوگ جو کچھ صحیح سمجھتے ہیں اس کو کرتے نہیں، کیوں کہ وہ اس کی قیمت دینا نہیں چاہتے۔

اخلاق کی قیمت کیا ہے، ایک لفظ میں اخلاق کی قیمت ہے —— قیمت نہ ملنے کے باوجود اخلاق برتنا۔ عام آدمی ہمیشہ مفاد کے تحت عمل کرتا ہے۔ یعنی جہاں ایک عمل کرکے کچھ بدلہ ملے وہاں وہ عمل کرے گا اور جہاں عمل کا بدلہ ملنے کی امید نہ ہو وہاں وہ عمل بھی نہیں کرے گا۔ جس سماج میں اس مزاج کے لوگ ہوں وہاں کبھی صحیح معنوں میں اخلاقی ماحول نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ زندگی میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ آدمی ایک اچھا سلوک کرے تو فوراً اس کو اپنے اچھے سلوک کا بدلہ مل جائے۔ دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو بدلہ کی امید کے بغیر اچھا سلوک کرنا جانیں۔ جو لوگ اپنے عمل کا فوراً بدلہ پانا چاہیں وہ کبھی اعلیٰ کردار کے مالک نہیں بنتے، اور اسی لیے وہ اس دنیا میں کوئی بڑا کام بھی نہیں کر سکتے۔

اخلاقی بنیاد فراہم کرنا دوسرے لفظوں میں اس کا نام ہے کہ لوگوں کو کوئی اتنی بڑی

چیز دی جاسکے جس کے بعد ہر چیز ان کی نظر میں چھوٹی ہو جائے۔ دوسروں کے ساتھ اخلاق برتنے کے لیے آدمی کو کچھ کھونا پڑتا ہے۔ آدمی کو اگر کوئی اتنی بڑی چیز مل جائے کہ اس کے مقابلہ میں ہر دوسری چیز چھوٹی نظر آئے تو اس کے لیے اخلاق پر قائم رہنا آسان ہو جائے گا۔ آدمی کو اس قابل بنائیے کہ وہ کھونے کو برداشت کر سکے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ با اخلاق ہو جائے گا۔

ایک مغربی ملک کا واقعہ ہے۔ ایک کسٹم افسر نے ایک شخص کو پکڑا جو ایک خلاف قانون چیز ملک کے اندر لے جانا چاہتا تھا۔ آدمی نے کسٹم افسر سے کہا کہ پانچ ہزار ڈالر لے لو اور مجھ کو چھوڑ دو۔ کسٹم افسر بگڑ گیا۔ اس نے کہا کہ دس ہزار ڈالر لے لو۔ کسٹم افسر اور زیادہ بگڑ گیا آدمی مزید قیمت بڑھاتا گیا۔ ۲۰ ہزار ڈالر، ۲۵ ہزار ڈالر، ۳۰ ہزار ڈالر، پچاس ہزار ڈالر۔ یہاں تک کہ اس نے کہا کہ ۸۰ ہزار ڈالر لے لو۔ اور چھوڑ دو۔ آدمی نے جب "۸۰ ہزار ڈالر" کہا تو کسٹم افسر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایک لمحہ وہ رکا اور اس کے بعد چیخ کر بولا:

ظالمو، تم میری قیمت کے قریب پہونچ گیے ہو

۸۰ ہزار ڈالر کا لفظ سن کر کسٹم افسر کے اندر ایک نیا خیال پیدا ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ سالہا سال تک سروس کرنے کے بعد بھی میں ۸۰ ہزار ڈالر بچا نہیں سکوں گا۔ اور یہ شخص مجھے ایک منٹ کے اندر ۸۰ ہزار ڈالر دے رہا ہے۔ پھر میں کیوں نہ اس کو قبول کر لوں۔ پانچ ہزار ڈالر اور دس ہزار ڈالر نے اس کو اندر سے نہیں ہلایا تھا۔ مگر ۸۰ ہزار ڈالر کی پیش کش نے اس کو اندر سے ہلا دیا۔ اس کے اندر جو اخلاقی بنیاد موجود تھی وہ متزلزل ہو کر رہ گئی۔

یہی ہر آدمی کا حال ہے۔ ہر آدمی کی قیمت کہیں نہ کہیں لگ جاتی ہے۔ اور جہاں آدمی کی قیمت لگ جائے۔ بس وہیں اس کے اندر اخلاقی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اصول کے بجائے مفاد کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے۔

کچھ لوگ ہیں جو سماجی پوزیشن کی خاطر با اخلاق ہوتے ہیں۔ وہ اپنے عام رویہ اور روزمرہ کی ملاقات میں بظاہر اچھے بنے رہتے ہیں تاکہ لوگ انھیں اچھا سمجھیں مگر یہ اخلاق کے لیے بہت کمزور بنیاد ہے۔ ایسے لوگوں کا اخلاق نہایت وقتی اخلاق ہوتا ہے۔ جیسے ہی کوئی

ذاتی انٹرسٹ کا موقع پیدا ہوتا ہے۔ ان کی حد آجاتی ہے۔ وہ ذاتی فائدہ حاصل کرنے کی خاطر اخلاقی اصول کو بھول جاتے ہیں۔

ایک شخص سرکاری دفتر میں کلیدی عہدہ (Key post) پر تھا۔ اس کے یہاں ایک صاحب کی فائل تھی۔ ان کا کیس بالکل جائز کیس تھا مگر وہ ان کو پریشان کر رہا تھا تاکہ وہ اس کو ایک بڑی رقم رشوت میں دیں۔ یہ صاحب اپنے جاننے والے ایک شخص سے ملے جن کے متعلق ان کو پتہ تھا کہ وہ مذکورہ سرکاری ملازم کے دوست ہیں۔ ان سے اپنی مصیبت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ بہت اچھا میں اس سے ملوں گا۔

یہ صاحب ایک روز مذکورہ سرکاری ملازم کے یہاں گیے۔ ملازم خندہ پیشانی سے ملا۔ اس نے چائے اور سگریٹ پیش کیا۔ مگر جب آنے والے نے اس سے اپنی ضرورت بیان کی تو فوراً اس کا چہرہ بدل گیا۔ طرح طرح کی قانونی موشگافیاں بتا کر اس نے عذر کر دیا۔ وہ مذکورہ شخص کو جان بوجھ کر صرف اس لیے پریشان کر رہا تھا کہ وہ اس کو ایک بڑی رقم رشوت کے طور پر دے۔ ایسی حالت میں رقم لیے بغیر وہ فائل کیسے واپس کر دیتا۔

مذکورہ سرکاری افسر ابتداءً با اخلاق تھا۔ مگر جب فائل کا مسئلہ طے کرنے کی بات آئی تو اس کے اخلاق کی حد آگئی۔ وہ صرف اس وقت تک با اخلاق تھا جب تک اس کے ذاتی مفاد پر زد نہ پڑ رہی ہو۔ جب ذاتی مفاد خطرے میں آجائے تو پھر اس کے نزدیک اخلاق کی کوئی قیمت نہ تھی۔

مغربی ملکوں میں بظاہر اس قسم کی بداخلاقی نہیں ہے۔ وہاں دفتروں میں بغیر رشوت کے کام ہوتا ہے۔ عام طور پر لوگ اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر انجام دیتے ہیں۔ پولیس کا آدمی کسی کو ناجائز کام کرتے ہوئے پکڑے تو اس آدمی کو معلوم ہے کہ وہ پولس والوں کی جیب میں نوٹ ڈال کر ان کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ روزمرہ کی زندگی میں جو بدعنوانیاں (Corruption) ہمارے ملک میں نظر آتی ہیں وہ مغربی ملکوں میں عام طور پر دکھائی نہیں دیتیں۔

تاہم یہ اخلاق قومی مفاد کی بنیاد پر بنا ہے اس لیے اس کی بھی حد آجاتی ہے۔

مثلاً مغربی ملکوں میں ایسا نہیں ہوتا کہ دودھ میں پانی ملایا جائے۔ نقلی سامان تیار کرکے بازار بھر دیئے جائیں۔ ایک تاجر نمونہ کے طور پر اچھا مال دکھائے اور اس کے بعد خراب مال پیک کرکے آپ کو بھیج دے۔ دفتروں میں اپنا جائز کام بھی رشوت کے بغیر نہ ہوسکے۔

مگر مغربی انسان کے اس اخلاق کی اس وقت حد آجاتی ہے جب کہ اس کا اخلاق قومی مفاد سے ٹکرانے لگے۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں بڑے بڑے ترقی یافتہ ملکوں کے یہاں سب سے زیادہ جس صنعت کو ترقی ہوئی ہے وہ جنگی صنعت ہے۔ ان ملکوں کے پاس تیار شدہ جنگی سامان کے انبار جمع ہوگیے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں انتہائی مہلک ہیں۔ وہ خدا کی دنیا کو جہنم بنا دینے والی ہیں۔ مگر ان کا قومی مفاد چاہتا ہے کہ وہ فروخت ہوں تاکہ ان پر جو بے پناہ لاگت آئی ہے وہ نفع کے ساتھ انھیں واپس ملے۔

اگر حالات بالکل معمول پر ہوں۔ ہر طرف امن وسکون ہو تو کوئی بھی ان کے مہلک ہتھیاروں کو نہیں خریدے گا۔ اس لیے یہ ترقی یافتہ قومیں یہ کرتی ہیں کہ عالمی سطح پر تناؤ کے حالات پیدا کرتی ہیں۔ ان کے رہنما اپنے تخریبی منصوبوں کے ذریعہ ایک ملک کو دوسرے ملک سے لڑاتے ہیں۔ وہ ہر علاقہ میں زبردستی ایک "اسرائیل" کھڑا کرتے ہیں تاکہ قوموں کے اندر خطرہ کی نفسیات پیدا ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ ان کے ہتھیار خریدیں۔

اپنے معاشرہ میں ذاتی سلوک کے معاملہ میں ان قوموں کے افراد با اخلاق ہیں۔ مگر جب ان کی قوم کے مفاد کا معاملہ آجائے تو وہاں ان کی حد آجاتی ہے۔ قومی مفاد کے معاملہ میں وہ ان سب چیزوں کو جائز کرلیتے ہیں جن کو وہ ذاتی مفاد کے معاملہ میں ناجائز کیے ہوئے تھے۔

ہر آدمی کی زندگی میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو اس کے لیے سب سے بڑی (Supreme) حیثیت رکھتی ہے۔ عام آدمی کے لیے اس کا ذاتی مفاد اس کے لیے سپریم ہوتا ہے۔ کچھ ترقی یافتہ معاشروں میں ان کا قومی مفاد ان کے لیے سپریم ہے۔ مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز اخلاق کی صحیح بنیاد نہیں۔ کیوں کہ ذاتی مفاد کی بنیاد پر بننے والے اخلاق کی اس وقت

حد آجائے گی جب کہ اس کا مفاد دوسرے کے مفاد سے ٹکرا رہا ہو۔ اسی طرح قومی مفاد کی بنیاد پر بننے والے اخلاق کی اس وقت حد آجاتی ہے جب کہ اپنی قوم کا مفاد اور دوسری قوم کا مفاد یکساں نہ رہے۔ اپنا قومی مفاد اگر اس میں ہو کہ لوگ جنگی سامان خرید کر قتل و غارت کا میدان گرم کریں تو وہ جنگی سامان بنائے گا اور اس کو دوسری قوموں کے ہاتھ فروخت کرے گا۔ خواہ اس کی قومی تجارت کا فروغ دوسری قوموں کی ہلاکت کی قیمت پر کیوں نہ ہو رہا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی ایک ہی صحیح بنیاد ہے اور وہ خدائے برتر کا عقیدہ ہے جو تمام کائنات کا خالق و مالک ہے۔ خدا تمام دوسری چیزوں سے بڑا ہے۔ وہ سب سے زیادہ سپریم ہے۔ جو شخص خدا کو پالے اس نے سب سے بڑی چیز کو پالیا۔ ایسے آدمی کی کبھی حد نہیں آئے گی۔ اس کی نظر میں ہر دوسری چیز چھوٹی ہو گی۔ خدا کو پاکر وہ آخری سب سے بڑی چیز کو پالے گا۔ اس کے بعد ہر دوسری چیز کی قربانی اس کے لیے آسان ہو جائے گی۔ وہ ہر دوسری چیز کا کھونا برداشت کرلے گا۔ کیوں کہ اس کو یقین ہو گا کہ کھونے کے بعد بھی اس کے پاس ایک چیز موجود ہے جو تمام چیزوں سے زیادہ بڑی ہے اور وہ اس کا خدا ہے۔

ایک ملحد کا اعتراف

برٹرینڈ رسل خدا کو نہیں مانتا۔ وہ انسانی معاملات کی تنظیم کے لیے انسانی قانون کو کافی سمجھتا ہے۔ مگر اسے یقین نہیں کہ ایسا ممکن ہے۔ وہ اس وقت اپنے کو لاجواب محسوس کرتا ہے کہ جب کہ ایک خدا پرست آدمی اس سے کہے کہ میں انسانی حاکم کی پکڑ سے بچ سکتا ہوں، مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں اپنے آپ کو خدائی حاکم کی سزا سے بچالوں:

> I might escape the human magistrate, but I could not escape punishment at the hands of the Divine Magistrate.

برٹرینڈ رسل نے جان لاک (۱۷۰۴-۱۶۳۲) کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذہبی عقیدہ کے مطابق خدا نے کچھ خاص اخلاقی قوانین مقرر کیے ہیں۔ جو لوگ ان

قوانین کی پیروی کریں وہ جنت میں جائیں گے اور جو لوگ ان قوانین کو توڑیں وہ اپنے عقیدہ کے مطابق اپنے لیے یہ خطرہ مول لیتے ہیں کہ انھیں جہنم میں ڈال دیا جائے۔ محتاط قسم کے خوشی کے متلاشی لوگ اس بنا پر نیک اور با اخلاق بن جائیں گے۔ گناہ آدمی کو جہنم میں لے جائے گا، اس عقیدہ میں زوال آنے کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ یہ بات مزید مشکل ہو گئی ہے کہ نیک زندگی اختیار کرنے کے حق میں ایسی دلیل لائی جائے جس کا آدمی خود لحاظ کر سکے۔ بنتھم جو کہ ایک آزاد خیال مفکر تھا، اس نے انسانی قانون ساز کو وہ جگہ دی جو مذہبی عقیدہ کے مطابق خدا کی جگہ تھی۔ اس کے نزدیک یہ قوانین اور سماجی حالات کا کام تھا کہ وہ فرد اور عوام کے مفادات میں ہم آہنگی پیدا کریں، تاکہ ہر شخص اپنی ذاتی خوشی تلاش کرتے ہوئے اجتماعی خوشی کو برقرار رکھنے پر مجبور ہو۔ مگر یہ اس سے کم اطمینان بخش ہے جتنا کہ جنت اور دوزخ کے عقیدہ کے تحت ذاتی مفادات اور عوامی مفادات میں ہم آہنگی کا پیدا ہونا، اس لیے بھی کہ انسانی قانون ساز ہمیشہ دانش مند یا نیک نہیں ہوتا، اور اس لیے بھی کہ انسانی حکومتیں ہمہ بیں اور ہمہ داں نہیں ہیں:

God has laid down certain moral rules; those who follow them go to heaven, and those who break them risk going to hell. The prudent pleasure-seeker will therefore be virtuous. With the decay of the belief that sin leads to hell, it has become more difficult to make a purely self-regarding argument in favour of a virtuous life. Bentham, who was a free-thinker, substituted the human lawgiver in place of God: it was the business of laws and social institutions to make a harmony between public and private interests, so that each man, in pursuing his own happiness, should be compelled to minister to the general happiness. But this is less satisfactory than the reconciliation of public and private interests effected by means of heaven and hell, both because lawgivers are not always wise and virtuous, and because human governments are not omniscient.

Bertrand Russell, *A History Of Western Philosophy*, pp. 592-93.

ترقی اور اتحاد

آج کل جو چیز سب سے زیادہ بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے وہ قومی ایکتا (کلچرل انٹگریشن) ہے۔ وسیع تر معنوں میں اس کو انسانی ایکتا بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایکتا آج ہماری بہت بڑی ضرورت ہے۔ اسی پر ملک کی ترقی اور کامیابی کا دارومدار ہے۔ مگر اس معاملہ میں بولنے والے جو کچھ بول رہے ہیں یا لکھنے والے جو کچھ لکھ رہے ہیں ان کو دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس بارہ میں لوگوں کا ذہن صاف نہیں کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں اس کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

اکثر لوگوں کی طرف سے یہ کہا جارہا ہے کہ نیشنل انٹگریشن کا ذریعہ کلچرل انٹگریشن ہے۔ یعنی لوگوں میں ایکتا پیدا کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ ان کا کلچر ایک کردیا جائے۔ زبان، مذہبی رسوم، لباس، تیوہار شادی بیاہ، اس قسم کی تمام چیزوں کو سب کے لیے یکساں اور مشترک بنادیا جائے۔ اس طرح لوگوں کے اندر وہ ایکتا یا انٹگریشن پیدا ہوجائے گا جس کی ہمیں ضرورت ہے۔

مگر اس تجویز کو میں ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسے کسی ملک میں تمام باشندوں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کی جائے کہ پلاسٹک سرجری کے ذریعہ تمام انسانوں کو ایک نقشہ کا بنادیا جائے۔ جس طرح یکساں قسم کی پلاسٹک سرجری کے ذریعہ مختلف قسم کے لوگوں میں اتحاد پیدا نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح مذکورہ قسم کی تدبیروں سے قومی ایکتا یا نیشنل انٹگریشن بھی پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی ایکتا کا راز ایک کلچر میں نہیں ہے بلکہ ایک ذہن میں ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں لوگوں کے اندر اس کے موافق سوچ پیدا کرنی ہوگی۔ پلاسٹک سرجری جیسا کوئی عمل ظاہری نقشہ کو بدل سکتا ہے مگر وہ اندرونی سوچ کو نہیں بدل سکتا۔ اور محض ظاہری چیزوں کو ایک کردینے سے کبھی حقیقی ایکتا نہیں آسکتی۔

لینن اور اتاترک

حقیقت یہ ہے کہ قومی ایکتا کا معاملہ ہو یا اور کوئی معاملہ، ہر چیز سوچ کی سطح پر ختم ہوتی ہے اور سوچ ہی کی سطح پر دوبارہ اسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس معاملہ کی وضاحت کے لیے ایک تقابلی مثال لیجئے۔ یہ تقابلی مثال لینن (۱۹۲۴-۱۸۷۰) اور اتاترک (۱۹۳۸-۱۸۸۱) کی ہے۔ دونوں تقریباً ہم زمانہ تھے۔ دونوں کو یکساں طور پر اقتدار ملا۔ مگر لینن کا نام کامیابی کی علامت ہے اور اتاترک کا نام

ناکامی کی علامت۔

کمال اتاترک کو ترکی میں ۱۹۱۹ میں اقتدار ملا اور ۱۹۳۸ تک (۱۹ سال) جاری رہا۔ کمال اتاترک نے چاہا کہ ترکی اور یورپ کی دوئی کو مٹا دے اور ترقی کے نقشہ پر دونوں کو یکساں مقام دیدے۔ اس کا کاراز اس نے "کلچرل یکسانی" میں دریافت کیا۔ اس نے ریاستی قوت کے ذریعہ یہ کوشش کی کہ ترکی کے لوگ یورپ والوں کی طرح ہیٹ اور پتلون پہنیں۔ وہ اہل یورپ کے آداب اختیار کریں۔ حتی کہ کمال اتاترک نے ترکی زبان کا رسم الخط بدل کر اس کو یورپی رسم الخط میں لکھنے کا حکم دیا جو اس سے پہلے عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ وغیرہ۔

کمال اتاترک نے ان "اصلاحات" کو بزور پورے ترکی میں نافذ کر دیا۔ مگر ان اصلاحات کے نفاذ پر تقریباً ستر سال گزرنے کے بعد بھی ترکی بدستور ایک مریض اور پسماندہ ملک ہے۔ یورپ کے نقشہ میں وہ ترقی یافتہ ملک کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔

اس کے برعکس مثال لینن کی ہے۔ لینن کو روس میں ۱۹۱۷ میں اقتدار ملا اور ۱۹۲۴ تک (۷ سال) جاری رہا۔ حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے جانا کہ موجودہ زمانہ کی اصل طاقت سائنس ہے۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ روس میں بڑے پیمانہ پر ایک دار الترجمہ قائم کیا۔ جس کے کارکنوں کی تعداد بعد کے مرحلہ میں، ایک لاکھ تک پہونچ گئی۔ اس نے حکم دیا کہ جرمن، فرنچ، انگلش وغیرہ زبانوں سے تمام سائنسی کتابوں کا ترجمہ روسی زبان میں کیا جائے۔ یہ کام اعلیٰ پیمانہ پر شروع ہو گیا اور برابر جاری رہا۔ یہ صحیح رخ پر صحیح اقدام تھا۔ چنانچہ روس کو اس کا یہ فائدہ ملا کہ وہ آج دو سپر پاور میں سے ایک سپر پاور کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ ہے تدبیر کا فرق۔ کمال اتاترک نے ترکی اور یورپ کے درمیان کلچر کے فرق کو مٹانا چاہا۔ مگر دونوں کے درمیان کلچر کے فرق کو مٹا دینے کے بعد بھی اس کو کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس لینن نے روس اور یورپ کے درمیان علم وشعور کے فرق کو مٹانے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ جب یہ فرق مٹا تو روس دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت بن چکا تھا۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ ہمیں غیر متعلق کارروائیوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ ہماری کارروائیوں کی تکمیل کے بعد بھی اصل مسئلہ وہیں باقی رہے گا جہاں وہ آج ہمیں دکھائی دے رہا ہے۔

چند مثالیں

ہمارے آس پاس جو واقعات ہیں ان کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ بات نہایت آسانی کے ساتھ سمجھی جاسکتی ہے کہ کلچر کا فرق یا کلچر کی یکسانیت اضافی چیزیں ہیں۔ ایکتا سے ان کا کوئی لازمی تعلق نہیں۔ چند مثالیں لیجئے۔

بمبئی میں پارسی اور ہندو ہزار برس سے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پارسی سماج ایک بند سماج ہے۔ وہ لوگ اپنے سے باہر شادی بیاہ کو صحیح نہیں سمجھتے چنانچہ بمبئی کے ہندوؤں اور پارسیوں میں آپس میں شادی بیاہ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مثال اس سے مختلف ہو تو وہ ایک نادر استثناء ہے نہ کہ کوئی عام قاعدہ۔ اس کے باوجود آج تک وہاں کبھی ہندوؤں اور پارسیوں میں لڑائی نہیں ہوئی۔ دونوں کے درمیان معیاری حد تک پر امن تعلقات ہیں۔ اس کے برعکس مثال ہندوؤں اور سکھوں کی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوؤں اور سکھوں میں باہمی شادی کا بے روک ٹوک رواج تھا۔ مگر انھیں دونوں فرقوں میں آج پنجاب میں اتنے بڑے پیمانہ پر لڑائی ہو رہی ہے جیسے کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوں۔ یہ سلسلہ بھنڈراں والا (پنجاب) اور آپریشن بلو اسٹار (اپریل ۱۹۸۶) کے وقت سے پوری شدت کے ساتھ جاری ہے، اور ہر قسم کی کوششوں کے باوجود ابھی تک وہ ختم نہ ہو سکا۔

اسی طرح مثلاً کہا جاتا ہے کہ تمام فرقوں کی زبان ایک ہو جائے تو اس کے بعد لوگوں کے درمیان ایکتا پیدا ہو جائے گی۔ مگر یہ بھی ایک غیر متعلق اور غیر مفید تجویز ہے۔ سوئزرلینڈ میں کئی زبانیں رائج ہیں۔ ان میں سے تین زبانوں کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے ــــ فرنچ، جرمن، اٹالین۔ مگر زبانوں کی کثرت کے باوجود ان کے درمیان کامل اتحاد اور ایکتا پایا جاتا ہے۔ بلکہ سوئزرلینڈ موجودہ دنیا کا سب سے زیادہ پُر امن ملک ہے۔ اس کے برعکس مثال پاکستان کی ہے۔ وہاں باقاعدہ طور پر صرف ایک سرکاری زبان ہے، یعنی اُردو۔ اس کے باوجو پاکستان میں اتنے زیادہ باہمی جھگڑے ہیں کہ پاکستان کے قیام پر چالیس سال سے زیادہ بیت گیے مگر آج تک وہاں کا جھگڑا ختم نہیں ہوا۔

اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ یک جہتی اور اتحاد کا تعلق لوگوں کی سوچ سے ہے نہ کہ ان کے ظاہری رسوم اور آداب سے۔ ملک کے باشندوں میں اگر صحیح سوچ موجود ہو اور وہ زندگی گزارنے کا راز جانتے ہوں تو وہ ظاہری فرق کے باوجود مل جل کر رہیں گے۔ اس کے برعکس اگر ان کی

سوچ درست نہ ہو، وہ زندگی کے راز سے واقفیت نہ رکھتے ہوں تو وہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہیں گے، خواہ ان کے ظاہری نشانات ایک جیسے کیوں نہ ہوں حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے معاملات کی درستگی میں اصل اہمیت طرزفکر (Attitude of mind) کی ہے۔ اگر ہم اس ملک میں یک جہتی اور مفاہمت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں لوگوں کے طرزفکر کو درست کرنا ہوگا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔

یہ واحد راستہ احترام اور رواداری کا راستہ ہے۔ لوگوں میں یہ مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ دوسروں کے ساتھ روادارانہ برتاؤ کریں۔ وہ ہر آدمی کا احترام کریں، خواہ وہ اپنی برادری کا ہو یا اپنے سے باہر کی برادری کا۔ یہی مزاج اتحاد اور یک جہتی کی اصل بنیاد ہے۔ یہ مزاج جہاں ہوگا وہاں اتحاد ہوگا، جہاں یہ مزاج نہ ہو، وہاں کسی اور تدبیر سے اتحاد پیدا نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن کی رہنمائی

اب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ اس معاملہ میں ہمیں قرآن سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔ یہ رہنمائی ایک لفظ میں، یہ ہے کہ انسان کے سوا بقیہ کائنات جس قانون پر چل رہی ہے، اسی کو انسان بھی اختیار کرلے۔ کائنات واضح طور پر مختلف اور متفرق اجزار کا مجموعہ ہے۔ اس میں آگ بھی ہے اور پانی بھی۔ اس میں نازک پودے بھی ہیں اور سخت پتھر بھی۔ اس میں دن کی روشنی بھی ہے اور رات کی تاریکی بھی۔ مگر ان تمام اختلافات کے باوجود، پوری کائنات ایک ہم آہنگ کُل کی طرح عمل کرتی ہے۔ یہ گویا ایک خدائی ماڈل ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ بھی اسی ماڈل کو اپنے لیے رہنما بنالے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور بقیہ کائنات دونوں ایک اکائی کے دو حصے ہیں۔ دونوں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ انسان ذاتی شعور اور ذاتی ارادہ رکھتا ہے، جب کہ کائنات کی دوسری چیزیں ذاتی شعور اور ذاتی ارادہ نہیں رکھتیں۔ جامد مادہ قانونِ فطرت (Law of nature) سے کنٹرول ہوتا ہے اور جاندار چیزیں اپنے اندر چھپی ہوئی جبلّت (Instinct) سے۔

قرآن کے مطابق، کائنات کا جو دین (نظام عمل) ہے۔ وہی انسان کا دین (نظام عمل)

بھی ہے۔ دونوں کی کامیاب کارکردگی کا راز ایک ہی فطری نقشہ میں چھپا ہوا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا (کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالاں کہ اسی کے تابع ہے وہ سب کچھ جو زمین و آسمان میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے کہ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمین میں انسان کو بسایا گیا ہے وہ ایک اصلاح یافتہ زمین ہے۔ اس کے تمام اجزا صحیح ترین کارکردگی پر قائم ہیں۔ ان میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں۔ اب انسان کو چاہیے کہ وہ اس نافذ شدہ نظام اصلاح سے مطابقت کرکے زمین پر زندگی گزارے۔ اگر وہ اس نقشہ سے مطابقت نہ کرے تو یہ زمین پر فساد برپا کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ کسی مجموعہ کا ایک جزء اگر مجموعہ سے مطابقت کرکے رہے تو نظام درست رہے گا۔ اور اگر مجموعہ کا کوئی جزء اصل مجموعہ کے غیر مطابق ہو جائے تو پورا انتظام بگڑ جائے گا۔ یہ اصلاحی نقشہ میں فساد برپا کرنے کا موجب بن جائے گا۔

اس کو ایک لفظ میں کائناتی پیٹرن کہا جا سکتا ہے۔ جو کائناتی پیٹرن کائنات کو کامیابی کے ساتھ چلا رہا ہے، وہی انسان کے لیے بھی مفید اور کامیاب ہے۔

دو پہلو

وہ چیز جس کو ہم نے کائناتی پیٹرن کہا ہے، اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک فنی (ٹکنکل) پہلو، دوسرا اخلاقی (ایتھیکل) پہلو۔ جہاں تک کائناتی پیٹرن کے ٹکنکل پہلو کا تعلق ہے، اس معاملہ میں انسان نے عین وہی کیا ہے جو اسے از روئے واقعہ کرنا چاہیے۔ وہ اس معاملہ میں حد درجہ سنجیدہ ہے۔ وہ انتہائی محنت سے اس کو دریافت کرتا ہے اور اس کی کامل پیروی کرتا ہے۔ کائناتی پیٹرن کے ٹکنکل پہلو سے وہ ادنیٰ درجہ میں بھی انحراف نہیں کرتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ٹکنکل پہلو کی کامل پیروی ہی کے ذریعہ وہ تمدنی ترقیاں حاصل کر سکتا ہے۔ مگر کائناتی پیٹرن کے اخلاقی پہلو کے بارہ میں اس کا رویہ یکسر مختلف ہے۔ یہاں وہ پیروی کے بجائے انحراف کی روش اختیار کرتا ہے۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لیے ایک سادہ سی مثال لیجیے۔ اس ہال میں ہمارے سامنے دو واقعے

نظر آرہے ہیں ۔ ایک بجلی جو ہم کو روشنی دے رہی ہے ، دوسرے پنکھا جس سے ہمیں ٹھنڈی ہوا ملتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں کائناتی پیٹرن کے ٹکنکل پہلو کی پیروی کرکے حاصل کی گئی ہیں۔ کائنات میں قانونِ قدرت کے تحت پیشگی طور پر ایک امکان موجود ہے ۔ وہ یہ کہ اگر آپ ایک ایسی مشین بنائیں جس میں میگنیٹک فیلڈ (مقناطیسی میدان) اور موشن (حرکت) کو یکجا کیا گیا ہو تو فوراً اس کے اندر الکٹران متحرک ہوجائیں گے اور وہ چیز پیدا ہوجائے گی جس کو کرنٹ (بجلی) کہتے ہیں ۔ جنریٹر میں اسی طریقہ کو استعمال کرکے بجلی پیدا کی جاتی ہے جس سے بلب روشن ہوتا ہے اور دوسرے کام کیے جاتے ہیں ۔

کائناتی پیٹرن کا ایک اور ٹکنکل پہلو یہ ہے کہ اگر آپ ایک ایسی مشین بنائیں جس میں میگنیٹک فیلڈ (مقناطیسی میدان) اور کرنٹ (بجلی) کو یکجا کیا جائے تو فوراً اس کے اندر موشن (حرکت) پیدا ہوجائے گی ، یہی قدرتی تدبیر ہے جس کے ذریعہ حرکت پیدا کرکے پنکھا چلایا جاتا ہے اور دوسری تمام مشینیں متحرک کی جاتی ہیں ۔

یہ کائناتی پیٹرن کے ٹکنکل پہلو کی مثال ہے ۔ دنیا کے تمام انسان ، خواہ وہ کسی بھی قوم یا فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں ، وہ اس پہلو کی صد فی صد پیروی کرتے ہیں ۔ وہ بال برابر بھی اس سے نہیں ہٹتے ۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہاں نتیجہ کا یا بالفاظ دیگر ، صحیح کارکردگی کا انحصار ، تمام تر اس پر ہے کہ خارجی قانون کی کامل پیروی کی جائے ۔

مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ کائناتی پیٹرن میں ٹکنکل پہلو پایا جاتا ہے ۔ یہی مثال یہ بھی بتاتی ہے کہ کائناتی پیٹرن میں ایک اور متعین پہلو موجود ہے ۔ اس کو باعتبار نوعیت ، اخلاقی پہلو (ایتھیکل پہلو) کہا جاسکتا ہے ۔ اس سے میری مراد کائنات میں پیشین گوئی کیے جانے کی قابلیت (Predictability) ہے ۔ کائنات مکمل طور پر قابل پیشین گوئی کردار (Predictable Character) کی حامل ہے ۔ مثلاً مذکورہ بالا مثال میں ، غیر متغیر طور پر یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ جب بھی میگنیٹک فیلڈ اور موشن کو یکجا کیا جائے گا تو لازماً وہاں کرنٹ پیدا ہوجائے گی ۔ اسی طرح جب بھی میگنیٹک فیلڈ اور کرنٹ کو یکجا کیا جائے گا تو وہاں لازماً موشن پیدا ہوجائے گا ۔ کائنات کا اس طرح قابل پیشین گوئی ہونا گویا اس کا وہ پہلو ہے جس کو انسانی زبان میں اخلاقی (ایتھیکل) پہلو کہا جاتا ہے ۔

موجودہ دنیا میں ہم یہ تضاد دیکھ رہے ہیں کہ ہماری ٹکنالوجی نہایت صحت کے ساتھ اپنا کام

کر رہی ہے۔ وہ ہمیشہ وہی مطلوبہ نتیجہ برآمد کرتی ہے جس کی اس سے امید کی گئی ہے۔ اس کے برعکس انسان غیر صحیح بنا ہوا ہے، انسان اس مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اترتا جس کی اس سے بجا طور پر امید قائم کی گئی ہو۔ اس تضاد کا واحد سبب یہ ہے کہ انسان نے کائناتی پیٹرن کے ٹکنکل پہلو کو تو پوری طرح اپنایا، مگر وہ اس کے اخلاقی پہلو کو اپنانے کے لیے تیار نہ ہو سکا۔

قابلِ پیشین گوئی کردار

قرآن میں پسندیدہ بندوں کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ اپنے عہد کو پورا کرنے والے لوگ ہیں جب کہ وہ کسی سے عہد کریں (والموفون بعہدھم اذا عاھدوا) یہ عین وہی اخلاقی صفت ہے جس کو ہم نے قابلِ پیشین گوئی کردار (Predictable Character) سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح لوہے کے اوپر کسی چھت کو کھڑا کیا جائے تو پیشگی طور پر یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ چھت کے بوجھ کو سنبھالے گا۔ اسی طرح جب ایک انسان دوسرے انسان سے کوئی عہد کرے تو پیشگی طور پر یہ اعتماد ہونا چاہیے کہ وہ ضرور اس عہد کو پورا کرے گا، وہ کسی حال میں اس سے نہیں ہٹے گا۔

اسی بات کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ منافق آدمی کی تین نشانیاں ہیں ـــــ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وہ وعدہ کرے تو اس سے پھر جائے۔ جب اس کو امانت سپرد کی جائے تو وہ امانت میں خیانت کرے (آیۃ المنافق ثلاث۔ اذا حدث کذب واذا وعد اخلف۔ واذا ائتمن خان)

مذکورہ تینوں باتیں قابلِ پیشین گوئی کردار کے خلاف ہیں۔ کسی انسان سے جب بات کی جاتی ہے تو اس اعتماد پر کی جاتی ہے کہ وہ صحیح بات کہے گا، وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے گا۔ اب اگر وہ خلاف واقعہ بات بولنے لگے تو اس نے پیشگی اندازہ کے خلاف عمل کیا۔ اسی طرح جب کسی سے عہد و پیمان کیا جاتا ہے تو اس یقین کی بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ اس کا آئندہ عمل عین اس عہد کے مطابق ہوگا۔ اب اگر آدمی اپنے کیے ہوئے عہد کے خلاف کرنے لگے تو اس نے اپنے بارہ میں پیشگی اندازہ کو پورا نہیں کیا۔ اسی طرح جب کوئی امانت کسی کے حوالے کی جاتی ہے تو وہ بھی اس پیشگی اعتماد کی بنیاد پر کی جاتی ہے کہ وہ ادائیگی کے وقت امانت کو پوری طرح ادا کرے گا۔ اب اگر بوقت ادائیگی وہ امانت کو اس کے حق دار کی طرف نہ لوٹائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قابلِ پیشین گوئی کردار کا حامل نہ تھا۔

کائنات اپنے قابل پیشین گوئی کردار کی وجہ سے کامل ہے، اسی طرح انسان بھی اس وقت کامل ہو سکتا ہے جب کہ وہ قابل پیشین گوئی کردار کا حامل بنے۔

کثرت میں وحدت

کائنات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کثرت میں وحدت کا اصول کارفرما ہے۔ یعنی چیزیں بظاہر مختلف اور متعدد ہیں۔ مگر جب ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام چیزیں اپنی آخری حقیقت کے اعتبار سے ایٹم (Atom) کا مجموعہ ہیں۔ ہر چیز بالآخر ایٹم ہے، خواہ بظاہر وہ کچھ بھی دکھائی دیتی ہو۔

یہی کائناتی پیٹرن انسانوں کے اندر بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ انسان بظاہر دیکھنے میں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ان میں رنگ اور دوسری چیزوں کے اعتبار سے بہت سے فرق پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کا تاریخی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام نسلیں آخرکار ایک ماں باپ پر جاکر ختم ہوتی ہیں۔ گویا سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں نہ کہ ایک دوسرے کے غیر۔

یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا نکالا، اور پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت زمین پر پھیلا دیئے (یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء)

یہی بات حدیث میں اس طرح آئی ہے: الا کلکم بنو آدم وآدم من تراب (سن لو کہ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے تھے) وحدتِ انسانیت کا یہ تصور ہر انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لیے محبت اور خیر خواہی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ وہ پوری انسانی نسل کو ایک خاندان اور ایک برادری کی مانند بنا دیتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

الخلق عیال اللہ فاحبُّ الخلق الی اللہ من احسنَ الی عیالہ	تمام مخلوق اللہ کی کنبہ ہے۔ پس تمام لوگوں میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

کائناتی ماڈل کثرت میں وحدت کی صفت رکھتا ہے۔ انسان کو بھی اسی کائناتی ماڈل پر اپنی زندگی

کا نقشہ بننا چاہیے۔ اس کو کئی میں ایک کا نمونہ بن جانا چاہیے۔ کائنات میں جب کثرت میں وحدت (Unity in diversity) کا اصول کارفرما ہے، تو انسان کے لیے درست نہیں کہ وہ یہاں کثرت کو ایک کرنے (Unification of diversity) کے طریقہ پر زندگی کا نظام بنانے کی کوشش کرے۔

حیاتیاتی اخوت

وحدت انسانیت یا وحدتِ بنی آدم کی حقیقت جس کا اعلان پیغمبر اسلام نے چودہ سو سال پہلے کیا تھا، اب وہ جدید تحقیقات کے نتیجہ میں ایک سائنسی واقعہ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

موجودہ زمانہ میں مالے کیول حیاتیات (Molecualr biology) نے بہت ترقی کی ہے۔ ڈی این اے (DNA) کے ذریعہ گہرے نسلی رازوں کو دریافت کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں جین کے ماہرین (Geneticists) کی ایک ٹیم نے یہ کام اپنے ذمہ لیا کہ وہ انسان کے مشترک جدِ اعلیٰ (Common ancester) کو دریافت کریں گے۔ ڈی این اے کے طریقہ میں ابتدائی باپ (Great-grandfather) کو دریافت کرنا زیادہ مشکل تھا۔ انھوں نے (Great-grandmother) (ابتدائی ماں) کا پتہ لگانے پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی۔

ان حیاتیاتی سائنس دانوں نے مختلف علاقوں کی ۱۴۷ حاملہ خواتین کو تیار کیا کہ وہ غیر مولود بچہ کے مادے (Placentas) انھیں بطور عطیہ دیں۔ اس مادہ پر وہ سالہا سال تک امریکہ کی ایرکنڈیشنڈ لیبارٹریوں میں تحقیق کرتے رہے جو برکلے میں واقع تھیں۔ انھوں نے ان سے جسمانی نسیج (Body tissue) کے نمونے نکالے اور ان پر طرح طرح سے تجربات کیے۔ آخر کار انھوں نے اعلان کیا ہے کہ انھوں نے پہلی خاتون (First woman) یا مذہبی اصطلاح میں حوا (Eve) کو دریافت کر لیا ہے۔ سائنس دانوں کے نزدیک یہ خاتون ۲۰۰ ہزار سال پہلے زمین پر آباد تھی۔ وہ تمام انسانوں کی مشترک ماں ہے، وہ ہم سب کی تقریباً 10,000 ویں دادی ہے۔

تحقیقات نے بتایا ہے کہ وہ تمام ظاہری فرق جن کی بنیاد پر نسلی اختلاف یا اونچی نسل اور نیچی نسل کے نظریات بنائے گئے تھے، وہ محض وقتی اور سطحی تھے۔ مثال کے طور پر جلد کا رنگ محض آب و ہوا سے مطابقت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ افریقہ میں کالا رنگ سورج سے بچاؤ کے لیے، یورپ میں سفید الٹرا وائلٹ شعاعوں کو جذب کرنے کے لیے جو کہ وٹامن ڈی کی پیدائش میں مددگار ہے۔ جلد کا رنگ

صرف چند ہزار سال کے عمل سے بدل جاتا ہے :

Skin colour, for instance, is a minor adaptation to climate -- black in Africa for protection from the sun, White in Europe to absorb ultraviolet radiation that helps produce vitamin D. It takes only a few thousand years of evolution for skin colour to change (p.42).

سائنس دانوں نے اپنے نتائج تحقیق کے مطابق اعلان کیا ہے کہ تمام بچوں کے ڈی این اے آخر کار ایک عورت تک جا پہونچتے ہیں۔ پہلی نظر میں یہ ناقابل قیاس دکھائی دے سکتا ہے کہ تمام انسانوں کا حیاتیاتی ذریعہ ایک واحد عورت تھی۔ مگر یہ قانونِ اتفاق کے تحت حاصل ہونے والا ایک نہایت ثابت شدہ نتیجہ ہے :

All the babies'DNA could be traced back, ultimately, to one woman ... At first glance it may seem inconceivable that the source of all mitochondrial DNA was a single woman, but it's a well-established outcome of the laws of probability (p.42).

برکلے کے حیاتیاتی سائنس دانوں (Geneticists) کی مذکورہ ٹیم کے علاوہ ایموری یونیورسٹی (Emory University) کی ٹیم نے بھی اس سلسلہ میں کام کیا ہے۔ اس ٹیم کے سربراہ پروفیسر ڈگلس (Douglas Wallace) تھے۔ اس ٹیم نے مزید یہ امکان ظاہر کیا ہے کہ پہلی خاتون (حوا) ممکن ہے ایشیا کے کسی حصہ میں رہتی ہو :

Eve might have lived in Asia (p.42)

یہ نتیجہ انھوں نے جینی شہادت (Genetic evidence) کی بنیاد پر نکالا ہے جو مختلف براعظموں کے سات سو آدمیوں کے خون کی خصوصی جانچ کے بعد حاصل کیا گیا ہے۔ یہ تحقیق خالص سائنسی سطح پر یہ ثابت کر رہی ہے کہ تمام انسانی نسل، ظاہری فرق کے باوجود، ایک عظیم خاندان (Great family) کی حیثیت رکھتی ہے (صفحہ ۴۳-۴۴)

اسی نوعیت کی تحقیقات انگلینڈ اور فرانس وغیرہ میں بھی ہو رہی ہیں۔ ان تحقیقات پر امریکہ کے کئی سائنسی جرنل میں مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں دو مقالات کا خلاصہ

نیویارک (امریکہ) کے انگریزی ہفت روزہ نیوز ویک (۱۱ جنوری ۱۹۸۸) میں سات صفحات پر شائع ہوا ہے۔

ان تحقیقات کے مطابق جینی شہادت (Genetic evidence) نے اس قدیم خیال کی تردید کردی ہے کہ انسانی نسل مختلف الگ الگ شاخوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا ہے کہ تمام اولاد آدم ایک ہی مشترک انسانی برادری کا حصہ ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر اسٹفن جے گولڈ (Stephen Jay Gould) نے کہا:

> This idea is tremendously important. It makes us realize that all human beings, despite differences in external appearance, are really members of a single entity that's had a very recent origin in one place. There is a kind of biological brotherhood that's much more profound than we ever realized (p. 39).

یہ تصور حیرت ناک حد تک اہم ہے۔ یہ ہم کو یقین دلاتا ہے کہ تمام انسان، خارجی ظواہر میں فرق کے باوجود، حقیقتہً ایک ہی واحد نسل کے افراد ہیں جو کہ بہت قریبی عہد میں ایک مقام پر شروع ہوئی تھی۔ یہاں ایک قسم کی حیاتیاتی اخوت ہے جو کہ اس سے بہت زیادہ گہری ہے جو اب تک ہم نے سمجھا تھا۔

وہ اخوت جو حیاتیاتی واقعہ کے طور پر پہلے سے پائی جارہی ہے، اس کو سماجی سطح پر اختیار کرلینا، یہی انسانی اتحاد اور انسانی یک جہتی کا واحد راز ہے۔ یہ اتحاد اور یک جہتی کا وہ فطری نسخہ ہے جس کا اشارہ خود ہماری پیدائشی بناوٹ میں موجود ہے۔ اس تحقیق نے ایک طرف ان تمام نظریات کو باطل ثابت کردیا ہے جو رنگ اور نسل کے فرق کی بنا پر انسانیت کو مختلف گروہوں میں بانٹے ہوئے تھے، دوسری طرف اس نے بتادیا ہے کہ انسانوں کے درمیان یک جہتی قائم کرنے کی فطری تدبیر کیا ہے۔

تنوع کا اصول

جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں اس کا نظام تنوع اور رنگا رنگی کے اصول پر قائم ہے۔ یہی تنوع انسانوں کے درمیان بھی مطلوب ہے۔ ہمیں انسانوں کے درمیان یہ مزاج بنانا چاہیے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہوں، وہ مختلف اور متنوع انسانوں کے ساتھ مل کر زندگی گزارنا سیکھیں۔ انسانی ایکتا قائم کرنے کے لیے فرق کو مٹانا قدرت کے نظام کے خلاف ہے، اس لیے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

مثال کے طور پر جانوروں کو لیجئے۔ جانوروں کی ایک ملین سے بھی زیادہ قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور ہر ایک کا ایک کام ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہاں زمین پر رینگنے والے کیڑوں کی بھی ضرورت ہے جو گندی اور بیکار چیزوں کو Decompose کرکے ہماری فضا کو برابر پاک صاف کرتے رہتے ہیں۔ یہاں بیل کی بھی ضرورت ہے جو ہمارے کھیت کو جوتے اور گھوڑے کی بھی ضرورت ہے جو ہماری سواری کے کام آئے، ایک طرف اگر یہاں چڑیوں کی ضرورت ہے جو چہچہائیں، تو دوسری طرف گدھے کی بھی ضرورت ہے کہ جب وہ چیخے تو آپ سوچیں کہ مجھے اس طرح چیخ کر نہیں بولنا چاہیے۔

یہی معاملہ تمام دوسری چیزوں کا ہے۔ اس دنیا میں بے حساب تنوع اور رنگارنگی ہے۔ اسی تنوع پر اس کا سارا نظام چل رہا ہے۔ اسی پیٹرن پر انسانوں کے پیدا کرنے والے نے انسانوں کے اندر بھی فرق اور تنوع رکھا ہے۔ اس تنوع کو باقی رکھنے ہی میں انسانیت کی ترقی اور کامیابی ہے۔ اس تنوع کو ختم کرنا ایسا ہی ہے جیسے انسانوں کو یکساں قد کا بنانے کے لیے لوگوں کو نیچے اوپر سے تراش کر برابر کیا جانے لگے۔

حدبندی کا نظام

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں حدبندی کا نظام قائم ہے۔ ہر چیز اپنے متعین دائرہ میں رہ کر اپنا کام کرتی ہے، وہ اپنے دائرہ سے نکل کر دوسرے دائرہ میں داخل نہیں ہوتی۔ یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: اور سورج اپنے مستقر پر چلتا ہے، یہ زبردست علم والے کا باندھا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کے لیے منزلیں مقرر ہیں۔ یہاں تک وہ ایسا رہ جاتا ہے۔ جیسے کھجور کی ٹہنی۔ نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے، سب ایک ایک دائرہ میں چل رہے ہیں (یٰس ۳۸-۴۰)

ان آیتوں میں اس فلکیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس کائنات کے تمام گھومنے والے ستارے اور سیارے حد درجہ صحت کے ساتھ اپنے اپنے مدار (Orbit) میں گھومتے ہیں۔ وہ کبھی اپنی حد کو چھوڑ کر دوسرے کی حد میں داخل نہیں ہوتے۔

یہی حدبندی انسان سے بھی مطلوب ہے۔ چنانچہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کی خلاف ورزی کریں وہ اللہ کی نظر میں ظالم ہیں (ومن یتعد حدود اللہ فاولئک ھم الظالمون، البقرہ ۲۲۹)

یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے : وحدّ حدوداً فلا تعتدوھا (اور اللہ نے حدیں قائم کر دی ہیں تو تم ان حدوں کی خلاف ورزی نہ کرو) ایک اور حدیث میں اس بات کو مثال کے ذریعے اس طرح واضح کیا گیا ہے :

مثل المومن ومثل الایمان کمثل الفرس فی اخیتہ یجول ثم یرجع الیٰ اخیتہ	مومن کی مثال اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے گھوڑا جو اپنی رسی میں بندھا ہوا ہو۔ وہ گھومتا ہے پھر وہ اپنی رسی کی طرف لوٹ آتا ہے۔

ایک گھوڑے کی گردن میں ۵ میٹر کی رسی ہو، وہ رسی ایک کھونٹے سے بندھی ہوئی ہو تو گھوڑا اپنی عادت کے مطابق چاروں طرف گھومے گا مگر وہ رسی کی لمبائی سے زیادہ نہ جا سکے گا۔ رسی اگر ۵ میٹر کی ہے تو اس کی حرکت کا دائرہ بھی ۵ میٹر تک محدود رہے گا۔

آسمان کے ستارے ایک ان دیکھی رسی میں بندھے ہوئے ہیں جو انھیں ان کے مقرر مدار (Orbit) سے باہر نہیں جانے دیتی۔ اسی طرح انسان کو بھی ایک اخلاقی رسی میں باندھا گیا ہے۔ یہ رسی صحیح اور غلط کی رسی ہے۔ اس کو صحیح کام کرنا ہے مگر غلط کام کی طرف قدم نہیں بڑھانا ہے۔ انسان کو انصاف پر قائم رہنا ہے، اس کو ظلم کرنے کی اجازت نہیں۔ اس کو جب بولنا ہے، سچ بولنا ہے۔ جھوٹ بولنا اس کے لیے جائز نہیں۔ اس کو اپنی ترقی اور کامیابی کے لیے سرگرم ہونے کی اجازت ہے مگر اس کو یہ اجازت نہیں کہ وہ دوسرے کو نقصان پہونچانے کی قیمت پر اپنے لیے فائدہ حاصل کرے۔

یہ حقیقت ایک لطیفہ میں بہت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔ ایک ملک کا واقعہ ہے۔ اس کو بیرونی اقتدار سے آزادی ملی۔ اس کے بعد وہاں کا ایک شہری سڑک پر نکلا۔ وہ خوشی سے جھومتا ہوا جا رہا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ زور زور سے ہلا رہا تھا۔ اس دوران اس کا ہاتھ ایک راہگیر کی ناک سے ٹکرا گیا۔ راہگیر نے غصہ ہو کر پوچھا کہ تم اس طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے کیوں چل رہے ہو۔ آہستگی کے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ شہری نے کہا کہ آج میرے ملک کو آزادی مل چکی ہے۔ اب میں آزاد ہوں کہ جو چاہوں کروں۔ راہگیر نے آہستگی کے ساتھ جواب دیا کہ تمہاری آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے :

Your freedom ends where my nose begins

اس دنیا میں ہر آدمی کو عمل کی آزادی ہے۔ مگر ایک شخص کو اپنا " ہاتھ " ہلانے کی آزادی وہیں تک ہے جہاں وہ دوسرے کی " ناک " سے نہ ٹکرائے۔ جیسے ہی دوسرے شخص کی ناک سے ٹکرانے کی حد شروع ہو، وہیں ہاتھ ہلانے والے کی آزادی کی حد بھی ختم ہو جائے گی۔

ادنیٰ سے اعلیٰ

ایک درخت کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ ادنیٰ کو اعلیٰ بنا سکتا ہے۔ وہ جامد مادہ کو نمو پذیر شئے میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ باہر سے مٹی اور پانی اور گیس لیتا ہے اور اس کو پتی اور پھول اور پھل کی صورت میں سامنے لے آتا ہے۔ اسی طرح کسی انسانی سماج کے بہتر سماج ہونے کا دارومدار تمام تر اس پر ہے کہ اس کے افراد یہ صلاحیت رکھتے ہوں کہ وہ ادنیٰ سلوک کو اعلیٰ سلوک میں تبدیل کر سکیں۔

اس معاملہ میں انسان کے نفسیاتی وجود کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے جیسا کہ بنانے والے نے اس کے حیاتیاتی وجود کو بنایا ہے۔ انسان جو چیزیں کھاتا ہے ان میں ایک جزء شکر کا ہوتا ہے۔ شکر اپنی ابتدائی صورت میں انسان کے لیے بے فائدہ ہے۔ چنانچہ انسان کے جسم میں پینکریاز (Pancreas) کا نظام رکھا گیا ہے جس کا عمل سادہ طور پر یہ ہے کہ وہ شکر کو انرجی (طاقت) میں تبدیل کرتا ہے۔ اسی تبدیلی کی صلاحیت پر انسان کی طاقت اور صحت کا انحصار ہے۔ جس آدمی کے جسم کا یہ سسٹم بگڑ جائے، اس کے اندر داخل ہونے والی شکر انرجی میں تبدیل نہیں ہوگی۔ وہ یا تو خون میں شامل ہو جائے گی یا پیشاب کے راستہ سے باہر آنے لگے گی۔ اس کے بعد انسان بے حد کمزور ہو جائے گا۔ اسی سے وہ مہلک بیماری پیدا ہوتی ہے جس کو ذیابیطس (Diabetes) کہا جاتا ہے۔

اگر ایک آدمی ذیابیطس کا مریض (Diabetic) ہو جائے۔ یعنی اس کا جسمانی نظام شکر کو انرجی میں تبدیل کرنے کی صلاحیت کھو دے تو زندگی اس کے لیے بے معنی ہو جائے گی۔ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بے کچھ ہو جائے گا۔ اسی طرح جو سماج اس مزاج سے خالی ہو جائے۔ یعنی اس کے افراد ادنیٰ سلوک کو اعلیٰ سلوک میں ڈھالنے کا ثبوت نہ دے سکیں، ایسا سماج ایک بیمار سماج ہے۔ ایسے سماج کو درست کرنے کی کوئی بھی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ اس کے اندر دوبارہ یہ اعلیٰ صلاحیت پیدا کی جائے۔

آج کل ہمارے سماج میں جو بگاڑ اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے

کے درمیان تہذیبی فرق ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارے سماج کے افراد نفسیاتی اعتبار ڈائبٹک ہوگیے ہیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت باقی نہیں رہی ہے کہ وہ "شکر" کو "انرجی" میں تبدیل کرسکیں۔ وہ بے طاقت کو اپنے لیے طاقت بنالیں۔

سماجی زندگی میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے ساتھ ناخوشگوار تجربات پیش آتے ہیں۔ ایک شخص کو دوسرے شخص سے کوئی شکایت پیدا ہوجاتی ہے۔ کسی کا مفاد دوسرے کے مفاد سے ٹکراجاتا ہے۔ ایک شخص ایسے الفاظ بولتا ہے جس کو سن کر دوسرا شخص محسوس کرتا ہے کہ وہ اس کی ذاتی یا قومی حیثیت پر چوٹ کررہا ہے۔ اس قسم کے واقعات سماجی زندگی میں لازماً پیش آتے ہیں اور پیش آتے رہیں گے۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم ایسے واقعات کی پیدائش کو روک دیں۔ ہمارے لیے جو چیز ممکن ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم ایسے واقعات سے منفی اثر نہ لیں۔

ایک تندرست آدمی اپنے اندر داخل ہونے والی شکر کو انرجی میں تبدیل کرتا ہے۔ یہی تبدیلی کا عمل نفسیاتی طور پر بھی مطلوب ہے۔ اس دنیا میں بہتر سماجی زندگی بنانے کا راز صرف یہ ہے کہ لوگوں کو شعوری اعتبار سے اس قابل بنایا جائے کہ وہ ناخوشگوار واقعہ کو خوشگوار تاثیر میں تبدیل کرسکیں۔ وہ غصہ کے جواب میں معافی پیش کریں اور برائی کرنے والوں کو اچھے سلوک کا تحفہ دیں۔

موجودہ سماج کے افراد نفسیاتی اعتبار سے ڈائبٹک ہوگیے ہیں۔ ان کی اس نفسیاتی بیماری کا علاج کیجئے، اور پھر آپ دیکھیں گے کہ جو سماج باہمی اختلافات کا گہوارہ بنا ہوا تھا وہ متنوع قسم کے پودوں اور درختوں کا خوشنما باغ بن گیا ہے۔

تبدیلی کا اصول

کائناتی پیٹرن کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہاں کا پورا نظام تبدیلی (Conversion) کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں کسی چیز کی افادیت کا معیار یہ ہے کہ وہ کنورژن کے اصول پر پوری اترے۔ مثلاً اس دنیا میں انسان کی سانس سے اور دوسرے اسباب سے بڑی مقدار میں کاربن ڈائی آکسائڈ گیس پیدا ہوتی ہے۔ درخت اس کو اپنے اندر لے لیتے ہیں۔ درخت کے اندر جو کاربن ڈائی آکسائڈ داخل ہوتی ہے، اگر وہ دوبارہ اس کو کاربن ڈائی آکسائڈ ہی کی صورت میں نکالیں تو پوری

فضا زہریلی ہو جائے اور انسان اور حیوانات کے لیے اس دنیا میں زندہ رہنا ناممکن ہو جائے۔ مگر درخت اس کاربن ڈائی آکسائڈ کو مخصوص عمل کے ذریعہ آکسیجن میں تبدیل کرتے ہیں اور اس کو آکسیجن کی صورت میں خارج کرتے ہیں۔ وہ دوسروں سے زہریلی گیس لے کر دوسروں کو مفید گیس کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔

اسی طرح مثلاً گائے کو دیکھئے۔ گائے گویا قدرت کی انڈسٹری ہے جو گھاس کھاتی ہے اور اس کو دودھ کی صورت میں ہمیں لوٹاتی ہے۔ وہ انسان کے لیے ناقابل خوراک چیز کو قابل خوراک چیز میں کنورٹ کرنے کا قدرتی کارخانہ ہے۔ گائے اگر ایسا کرے کہ وہ گھاس کھاکر گھاس خارج کرنے لگے تو وہ اپنی قیمت اور افادیت کھودے گی۔

کنورژن (تبدیلی) کا یہ اصول جو بقیہ دنیا میں قائم ہے، وہی انسان سے بھی مطلوب ہے بقیہ دنیا کی صحیح کارکردگی کا راز یہ ہے کہ وہ کنورژن کے اصول پر کام کر رہی ہو۔ اسی طرح بہتر زندگی اور کامیاب انسانی سماج بنانے کا راز بھی یہی ہے کہ اس کے افراد اس صلاحیت کا ثبوت دے سکیں کہ وہ "گھاس" پائیں اور اس کو "دودھ" کی صورت میں دنیا والوں کی طرف لوٹا سکیں۔

قرآن میں سچے انسانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب انھیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں (واذا ما غضبوا ھم یغفرون) یعنی دوسروں کی طرف سے انھیں ایسے سلوک کا تجربہ ہوتا ہے جو ان کے اندر غصہ اور انتقام کی آگ بھڑکانے والا ہو، مگر وہ غصہ اور انتقام کی آگ کو اپنے اندر ہی اندر بجھا دیتے ہیں اور دوسرے شخص کو جو چیز لوٹاتے ہیں وہ معافی اور درگذر کا سلوک ہوتا ہے نہ کہ غصہ اور انتقام کا سلوک۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں۔ تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی قریبی دوست (حم السجدہ ۳۴) اس آیت کے بارہ میں حضرت علی بن ابی طالبؓ نے فرمایا:

امر اللہ المومنین بالصبر عند الغضب والحلم عند الجھل والعفو	اللہ نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ غصہ کے وقت صبر کریں۔ کوئی جہالت کرے تو اس کو

عند الاساءة فاذا فعلوا ذالك عصمهم الله من الشيطان وخضع لهم عدوهم كانه ولی حمیم

برداشت کریں۔ برائی کی جائے تو معافی اور درگذر کا طریقہ اختیار کریں جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان سے بچائے گا اور ان کے دشمن کو اس طرح جھکا دے گا کہ وہ ان کا قریبی دوست بن جائے۔

یہ وہی صفت ہے جس کو اوپر ہم نے کنورژن سے تعبیر کیا ہے۔ خدا پرست آدمی کی خدا پرستی اس کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ برائی کو بھلائی میں تبدیل کر سکے۔ جو لوگ اسے گالی دیں، ان کے لیے وہ دعا کرے۔ جو لوگ اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک کریں ان کے ساتھ وہ انسانی سلوک کا طریقہ اختیار کرے۔ جو لوگ اس سے کڑوا بول بولیں، ان کا استقبال وہ میٹھے بول سے کرے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہتر سماج کی تعمیر کے لیے ہماری کوششوں کا رُخ کیا ہونا چاہیے۔ وہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم افراد کے اندر "کنورژن" کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ موجودہ دنیا میں صالح سماج اسی کنورژن کے ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، اس کے سوا صالح سماج بنانے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔

ایک مثال

سچے انسان کو لوگوں کے درمیان کس طرح رہنا چاہیے، اس کی بہترین میکینکل مثال شاک ابزاربر (Shock absorber) کی ہے۔ شاک ابزاربر کے لفظی معنی ہیں جھٹکے کو سہنے والا۔ یہ ایک آلہ ہے جو کہ موٹر گاڑیوں میں لگایا جاتا ہے اور ایکسل اور باڈی کے درمیان ایک قسم کے گدے کا کام کرتا ہے۔ وہ سڑک کی سطح کے تموج سے پیش آنے والے جھٹکوں کو باڈی تک پہونچنے سے روکتا ہے:

A device which on an automobile, acts as a cushion between the axles and the body and reduces the shocks on the body produced by undulations of the road surface (IX/159).

اگر آپ ٹریکٹر پر ۵۰ کیلومیٹر کا سفر کریں تو آپ اپنی منزل پر اس طرح پہونچیں گے کہ آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔ اس کے برعکس جب آپ ایک اچھی موٹر کار پر ۵۰ کیلومیٹر کا سفر کریں تو آپ منزل پر اس طرح اترتے ہیں کہ آپ بالکل تازہ دم ہوتے ہیں۔

دونوں گاڑیوں میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب شاک ابزاربر ہے۔ کار جب چلتی ہے تو زیادہ تر اس کا پہیہ نیچے اوپر ہوتا ہے، باڈی نیچے اوپر نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جب ٹریکٹر چلتا ہے تو اس کا پہیہ اور باڈی دونوں نیچے اوپر ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، کار اس گاڑی کا نام ہے کہ جو جھٹکا گاڑی کو لگا وہ گاڑی تک رہ گیا، وہ مسافر تک نہیں پہونچا۔ اس کے برعکس ٹریکٹر اس گاڑی کا نام ہے کہ جو جھٹکا گاڑی کو لگا وہ گاڑی تک نہیں رُکا، بلکہ وہ مسافر تک پہونچ گیا۔

سچا انسان دنیا میں کار کی طرح جیتا ہے، اور جھوٹا انسان ٹریکٹر کی طرح۔ سچے انسان کے سینے میں ایک "شاک ابزاربر" ہوتا ہے جو تمام جھٹکوں اور صدموں کو اندر ہی اندر سہتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس جھوٹے انسان کے اندر "شاک ابزاربر" نہیں ہوتا۔ وہ ہر جھٹکے کو دوسروں تک پہونچاتا رہتا ہے۔ اچھا سماج بنانا ہے تو سچے انسان بنائیے۔ کیوں کہ یہ دراصل جھوٹے انسان ہی ہیں جو سماج کو بگاڑ اور فساد سے بھر دیتے ہیں۔

یک طرفہ طریقہ

دہلی کے ایک انگریزی اخبار میں میں نے ایک آرٹیکل پڑھا۔ اس کا عنوان تھا دوطرفہ طریقہ بہترین طریقہ ہے (Bilateralism is Best)۔ یعنی دو فریقوں کے درمیان نزاع ہو تو اس کو حل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں "ففٹی ففٹی" پر راضی ہو جائیں۔ پچاس فیصد ذمہ داری ایک فریق لے اور پچاس فی صد ذمہ داری دوسرا فریق لے۔ اور اس طرح معاملہ کو ختم کر دیا جائے۔

یہ بات گرامر کے لحاظ سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہے۔ کیوں کہ وہ موجودہ دنیا میں ناقابل عمل ہے۔ اس دنیا میں کوئی نزاع اسی وقت ختم ہو سکتی ہے جب کہ ایک فریق یک طرفہ طور پر اس کو ختم کرنے پر راضی ہو جائے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ یک طرفہ طریقہ بہترین طریقہ ہے:

Unilateralism is Best

پیغمبر اسلامؐ نے جھگڑوں اور شکایتوں کو ختم کرنے کا یہی طریقہ بتایا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ: احسن الیٰ من اساء الیک (جو شخص تمہارے ساتھ برا سلوک کرے، اس کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو) یعنی ردعمل کا طریقہ اختیار نہ کرو۔ اور نہ اس کا انتظار کرو کہ دوسرا فریق پچاس فیصد جھکے تو تم بھی پچاس فی صد جھک جاؤ۔ اس کے برعکس خداپرست انسان کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ یک طرفہ حسن سلوک کا طریقہ اختیار کرے۔ اسی یک طرفہ حسن اخلاق کا دوسرا نام صبر ہے۔ اور اسی صبر میں بہتر انسانی سماج کا راز چھپا ہوا ہے

تعمیر کی طرف

امریکہ کے سابق صدر رچرڈ نکسن (- ۱۹۱۳) نے اپنی کتاب "فتح بغیر جنگ" میں دوسرے ملکوں کے ساتھ ہندستان کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ ہندستان کے سیاسی نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

Those who believe India is not governed well should remember how miraculous it is that it is governed at all.

Richard Nixon, *1999-Victory Without War*, 1988.

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندستان میں اچھی حکومت قائم نہیں، انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ خود کیسا عجیب معجزہ ہے کہ وہاں حکومت قائم ہے (انڈین اکسپریس، ۲۱ اپریل ۱۹۸۸)

ہندستان کے اجتماعی نظام کے بارہ میں مسٹر نکسن کا یہ تبصرہ یقیناً بہت سخت ہے۔ مگر دانش مندی یہ ہے کہ اس پر شکایت کرنے کے بجائے اس کو ہم اپنے لیے ایک چیلنج سمجھیں۔ کہنے والے کے خلاف غصہ اتارنے کے بجائے ہم اپنی ساری توجہ ملک کی داخلی تعمیر میں لگا دیں۔ ہم ملک کو اتنا اونچا اٹھائیں کہ کسی "نکسن" کو ہمارے خلاف اس قسم کا ریمارک دینے کی ہمت نہ رہے۔

اس کی ایک مثال جاپان ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ پر جاپان دنیا کی نظر میں ایک حقیر ملک بن گیا تھا۔ مگر اس کے بعد ۴۰ سالہ محنت کے ذریعہ جاپان نے اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھالیا کہ اب کسی کو اس کے خلاف بولنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

ضرورت ہے کہ ہم از سر نو اپنے معاملہ پر غور کریں۔ اور کسی تاخیر کے بغیر صحیح رخ پر اپنا سفر شروع کر دیں تاکہ ہمارا مستقبل، ہمارے حال کے مقابلہ میں، بہتر اور شاندار ہو سکے۔

نئی دہلی کے انگریزی اخبار انڈین اکسپریس (۷ فروری، ۱۴ فروری ۱۹۸۷) میں ہندستان کے سینیر جرنلسٹ ایس ملگاؤکر (S. Mulgaokar) کا ایک آرٹیکل دو قسطوں میں چھپا تھا جس کا عنوان یہ تھا:

Can systemic changes provide the entire answer

(کیا ڈھانچہ میں تبدیلی مکمل جواب ہے) مضمون نگار نے اس میں کہا تھا کہ ہماری آزادی پر چالیس سال

بیت چکے ہیں۔ ہم نے کئی اعتبار سے ترقی بھی کی ہے۔ مگر ہمارے مسائل ابھی بہت زیادہ ہیں، اور مجموعی طور پر ہمارے مسائل ہماری ترقی سے بڑھے ہوئے ہیں :

Our problems are many and serious, and on balance, appear to outweigh the progress.

مسٹر ملگاؤ کر نے ان لوگوں کی بات کو نہیں مانا تھا جو حالات کو ٹھیک کرنے کے لیے ڈھانچہ میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ڈھانچہ کو آخر کار آدمی ہی تو چلاتے ہیں۔ جب آدمی اچھے نہ ہوں تو ڈھانچہ کیسے اچھا کام کرے گا :

In the final analysis, a system is only as good as those who operate it.

مسٹر ملگاؤ کر کی اس بات سے مجھے اتفاق ہے۔ اس کو بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ مہاتما گاندھی نے ہمارے ملک کو سیاسی بنیاد (Political base) دی۔ اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں اقتدار آیا اور انھوں نے اس ملک کو صنعتی بنیاد (Industrial base) دی۔ اب ضرورت ہے کہ تیسرا ضروری کام کیا جائے۔ اور وہ ہے اس ملک کو اخلاقی بنیاد (Moral base) دینا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تیسری چیز (اخلاقیات)، قومی زندگی میں فیصلہ کن عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تقریباً سبھی لوگوں نے اعتراف کیا ہے۔

ملک کو اخلاقی بنیاد دینے کا کام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ مشکل ترین کام ہے۔ اور اس کے لیے نہایت صبر آزما جدوجہد کی ضرورت ہے۔ لمبی خاموش جدوجہد کے ذریعہ ہمیں یہ کرنا ہے کہ لوگوں کے اندر اخلاقی بیداری (Moral awareness) پیدا کریں۔ قومی تعمیر کے سلسلہ میں یہ بہت بنیادی بات ہے۔ اس اصلاحی کام میں ہمارا سفر ذہنی تعمیر (Mind building) سے شروع ہونا چاہیے نہ کہ سیاسی ڈھانچہ کے خلاف مظاہرہ اور ایجی ٹیشن سے، اس مہم میں ہمارا نشانہ انسان کو بدلنا ہے نہ کہ حکمرانوں کو بدلنا۔

اخلاقی بیداری کا لفظ یہاں میں کسی محدود معنی میں نہیں بول رہا ہوں، بلکہ وسیع معنی میں بول رہا ہوں۔ اس سے میری مراد خاص طور پر وہ چیز پیدا کرنے سے ہے جس کو دوسرے لفظوں میں

تعمیری سوچ (Constructive thinking) کہا جا سکتا ہے۔ یعنی رد عمل کا طریقہ چھوڑ کر مثبت طریقہ کا پابند ہونا۔ مسائل کو لڑے بغیر حل کرنے کی کوشش کرنا۔ دوسروں سے ٹکراؤ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی زندگی کا سفر طے کرنا۔ ممکن چیز (Possible) سے اپنا عمل شروع کرنا نہ کہ اس چیز سے جو ناممکن (Impossible) ہے۔ یہی اصلاح کا حقیقی طریقہ ہے۔ اس کے سوا جو طریقے ہیں، وہ سب کھونے کے طریقے ہیں، وہ پانے کے طریقے نہیں۔

جاگ یا اویرنس پیدا کرنے کا کام اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب کہ وہ تعمیری انداز میں ہو۔ یعنی اس کا رخ اپنی طرف ہو نہ کہ دوسروں کی طرف۔ دوسروں سے مانگ کرنے کے بجائے اپنے آپ کو دیکھا جائے۔ اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ابھارا جائے۔ لوگوں کے اندر جذباتی اندازِ فکر (Emotional approach) ختم کیا جائے اور ان کے اندر عقلی اندازِ فکر (Rational approach) پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ ذہن بنایا جائے کہ لوگ معاملہ کو دوسرے کے اوپر نہ ڈالیں بلکہ اس کی ذمہ داری خود قبول کریں۔ جہاں معاملہ ایک سے زیادہ آدمیوں کا ہو وہاں ذمہ داری خود قبول کرنے سے مسئلہ حل ہوتا ہے، دوسروں کے اوپر ڈالنے سے کبھی مسئلہ ختم نہیں ہو سکتا۔

اویرنس پیدا کرنے کا یہ کام مجاریٹی کیونٹی اور مائناریٹی کیونٹی دونوں کے درمیان کرنا ہے۔ دونوں کے اندر یہ سوچ ابھارنا ہے کہ وہ دوسروں کو الزام دینے کا طریقہ چھوڑیں اور اپنے آپ میں جھانک کر دیکھنے کا مزاج پیدا کریں۔ وہ ماضی کی باتوں کو بھلائیں اور مستقبل کے لحاظ سے اپنی منصوبہ بندی کریں۔

اسی کے ساتھ ایک اور چیز ہے جو لیڈرشپ کی سطح پر مطلوب ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے لیڈروں نے "انگریز ہٹاؤ" کا نعرہ دیا تھا۔ اس کے بعد مسز اندرا گاندھی نے "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ دیا۔ مسٹر راجیو گاندھی نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ۷۹ ویں اجلاس (اپریل ۱۹۸۸) میں "بیکاری ہٹاؤ" کا نعرہ دیا ہے۔ مگر محض اس قسم کے نعروں سے ملک کا مسئلہ نہ اب تک حل ہوا ہے اور نہ آئندہ حل ہونے والا ہے۔ اصلی نعرہ جس سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے، وہ ہے — "اپنے آپ کو ہٹاؤ"

حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کو سیاسی اعتبار سے ایک ڈی گال کی ضرورت ہے۔ ہمارے

لیڈر اگر ڈیگال بننے کا حوصلہ کریں تو سارے مسائل چند برسوں میں حل ہو سکتے ہیں۔ موجودہ نعروں کی صورت میں وہ سو برس میں بھی حل ہونے والے نہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قوم کو زندہ کرنے کے لیے فرد کو اپنے آپ کو ہلاک کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں فرانس کے چارلس ڈیگال (۱۸۹۰ - ۱۹۷۰) نے اس کی ایک مثال پیش کی ہے۔ اور ہندستان کو آج اپنے حالات کے اعتبار سے اسی قسم کے ایک ڈیگال کی ضرورت ہے۔

ڈیگال ۱۹۵۸ میں فرانس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس وقت افریقہ میں فرانس کے تقریباً ایک درجن مقبوضات تھے جن میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ خاص طور پر الجیریا میں یہ تحریک بہت شدت اختیار کر چکی تھی۔ فرانس نے اس کو کچلنے کے لیے تقریباً ۲۵ لاکھ لوگوں کو سزائیں دیں یا قتل کر دیا۔ اس کے باوجود الجیریا میں آزادی کی تحریک دبتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ صورت حال چارلس ڈیگال کے لیے سخت تشویش ناک بن گئی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے الفاظ میں، الجیریا کی جنگ کے مسائل ان کے لیے اس میں روک بن گئے کہ وہ مستقبل کی مثبت پالیسیوں (Positive policies) کے بارہ میں خاکہ بنانے سے زیادہ کچھ کر سکیں (جلد ۷، صفحہ ۹۶۴)

فرانس اپنے افریقی مقبوضات کو فرانس کا صوبہ (Province) کہتا تھا۔ وہ ان کی زبان اور کلچر کو اس حد تک بدل دینا چاہتا تھا کہ وہاں کے باشندے اپنے آپ کو فرانسیسی کہنے اور سمجھنے لگیں، مگر یہ منصوبہ فرانس کے لیے بہت مہنگا پڑا۔ عملاً یہ ممالک فرانس کا صوبہ نہ بن سکے اور اس غیر حقیقت پسندانہ کوشش نے خود فرانس کو ایک کمزور ملک بنا دیا۔ فرانس کی تمام بہترین طاقت مقبوضہ ممالک میں آزادی کی تحریکوں کو دبانے اور کچلنے میں استعمال ہونے لگی اور فرانس نے یورپ کی ایک عظیم طاقت (Great power) ہونے کی حیثیت کھو دی۔

سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ افریقہ پر قبضہ کرنے کی کوشش میں فرانس ایٹمی دوڑ میں پیچھے ہو گیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ چارلس ڈیگال نے محسوس کیا کہ نوآبادیاتی جنگ لڑنے کی کوشش فرانس کے لیے اس میں مانع ہو گئی ہے کہ وہ بڑے پیمانہ پر ایٹمی تحقیق کرے۔ چنانچہ ڈیگال نے الجیریا کو آزاد کر دیا اور اس کے بعد مضبوط ایٹمی طاقت کو وجود میں لانے کی کوشش شروع کر دی جو فرانس کی عظیم حیثیت کے لیے نئی بنیاد بن سکے۔ (جلد ۴، صفحہ ۹۰۵)

ڈیگال نے معاملہ کو قومی سا کھ یا ذاتی قیادت سے الگ ہو کر دیکھا۔ ٹھنڈے دل سے سوچنے کے بعد وہ اس رائے پر پہونچے کہ اس مسئلہ کا حقیقت پسندانہ حل صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ افریقی مقبوضات کو آزاد کر دیا جائے۔ تاہم فرانس کے لیے یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ فرانس کے قومی عزت ووقار (National prestige) کا مسئلہ تھا اور قومی وقار ایسی چیز ہے کہ قومیں لڑ کر تباہ ہو جاتی ہیں مگر وہ اپنے وقار کو کھونا برداشت نہیں کرتیں۔ یہ یقینی تھا کہ جو شخص اس معاملہ میں قومی وقار کے خلاف فیصلہ کرے گا وہ فرانس میں اپنی مقبولیت کو یکسر ختم کر دے گا۔ تاہم ڈیگال نے یہ خطرہ مول لیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں، ڈیگال نے الجیریا کے مسئلہ کو اس وقت حل کر دیا جب کہ ان کے سوا کوئی دوسرا شخص اس کو حل نہیں کر سکتا تھا (جلد ۷، صفحہ ۹۶۵)

جنرل ڈیگال نے اس کے بعد الجیریا کے لیڈروں کو گفت و شنید کی دعوت دی۔ اس گفت و شنید کا فیصلہ عین منصوبہ کے تحت الجیریا کے حق میں ہوا۔ یعنی حکومت فرانس اس پر راضی ہو گئی کہ الجیریا میں ریفرنڈم کرایا جائے اور لوگوں سے پوچھا جائے کہ وہ فرانس کی ماتحتی پسند کرتے ہیں یا آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ ریفرنڈم ہوا۔ پیشگی اندازے کے مطابق الجیریا کے باشندوں نے آزاد الجیریا کے حق میں اپنی رائیں دیں اور اس کا احترام کرتے ہوئے حکومت فرانس نے جولائی ۱۹۶۲ میں الجیریا کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

اس کے نتیجہ میں چارلس ڈیگال پر سخت تنقیدیں ہوئیں۔ ان کے اوپر قاتلانہ حملے کیے گیے۔ اس کے بعد عوام کے دباؤ کے تحت ڈیگال نے فرانس میں ایک ریفرنڈم کرایا جس میں ڈیگال کو شکست ہوئی۔ بالآخر انھوں نے ۲۸ اپریل ۱۹۶۹ کو صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ۹ نومبر ۱۹۷۰ کو ان پر قلب کا دورہ پڑا اور ان کا انتقال ہو گیا۔ ڈیگال ایک معمولی قبرستان میں اس طرح دفن کر دیے گیے کہ ان کے جنازے میں ان کے رشتہ داروں اور چند دوستوں کے سوا کوئی اور شریک نہ تھا۔ ڈیگال خود مر گیے۔ مگر انھوں نے مر کر اپنی قوم کو دوبارہ زندگی دے دی۔

ڈیگال کے اس واقعہ سے یورپ میں ایک اصطلاح بنائی گئی ہے جس کو گالزم (Gaulism) کہا جاتا ہے۔ گالزم دراصل اپنی قیادت کی قیمت پر قوم کو بچانا ہے۔ برٹانیکا (۱۹۸۴) کے الفاظ میں، ڈیگال تنہا شخص تھے جس میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ ایسے نازک فیصلے لے سکیں جن سے سخت قسم کے سیاسی اور شخصی خطرات (Political and personal risks) وابستہ ہوتے ہیں (7/965)

یہی گالزم قومی زندگی کا راز ہے۔ ہندستان کو آج ایسے باحوصلہ سیاست داں کی ضرورت ہے جو ملکی حالات کے اعتبار سے "گالزم" کے اصول پر عمل کر سکے۔ جو اپنے ذاتی فائدہ پر قوم کے فائدہ کو مقدم کرے۔ جو اپنے مستقبل کو ہلاک کر کے قوم کے مستقبل کی تعمیر کر سکے، ہماری دعا ہے کہ ہندستان کو اسی قسم کا ایک ڈیگال مل جائے۔ موجودہ بھنور سے نکلنے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔

ہمارے موجودہ لیڈروں کی اصل خرابی یہ ہے کہ وہ ہر معاملہ کو "ووٹ" کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں نہ کہ ملکی مفاد کے نقطۂ نظر سے۔ حکمرانوں کی ایک نسل میں اگر یہ مزاج آجائے کہ وہ ذات کے بجائے ملک کو مقدم کر سکیں تو اس کے بعد فوراً ملکی تعمیر کا سفر شروع ہو جائے گا۔ اور جو سفر ایک بار شروع ہو جائے وہ بہر حال اپنی منزل پر پہونچ کر رہتا ہے۔

تاریخ کا سبق

جرمن ڈکٹیٹر اڈولف ہٹلر (۱۹۴۵-۱۸۸۹) ذاتی حفاظت کے لئے اپنے پاس ایک خاص پستول رکھتا تھا۔ اس پستول پر سونے کا کام تھا۔ اور اس کا دستہ ہاتھی دانت کا بنا ہوا تھا۔ یہ پستول دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکی فوجیوں کو میونخ میں ہٹلر کے مکان میں ملا۔ اس وقت سے یہ پستول محفوظ رکھا ہوا تھا۔ تازہ اطلاع کے مطابق اس کو نیلام کر دیا گیا ہے۔ ایک شخص نے اس کو ۱۱۴۸۰۰۰ ڈالر میں خرید لیا۔ یہ پستول اور بندوق کی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ قیمت ہے جو کسی ایک دستی ہتھیار کو ادا کی گئی۔ (ٹیلیگراف ۲۲ نومبر ۱۹۸۷)

دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہٹلر کو سابق متحدہ جرمنی میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی حتیٰ کہ وہ ملک کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ تاہم اس "قائد اعظم" نے جرمنی کو "قوم اصغر" بنانے کے سوا اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ ہٹلر نے جو حالات پیدا کئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کا وسیع ملک تقسیم ہو کر کئی حصوں میں بٹ گیا۔ اور اس پر چار بیرونی طاقتوں (روس، برطانیہ، امریکہ، فرانس) کا غلبہ قائم ہو گیا۔ خود ہٹلر کا آخری انجام یہ ہوا کہ جس پستول کو وہ اپنی ذاتی حفاظت کے لئے ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا، دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد اس نے ۳۰ اپریل ۱۹۴۵ کو اسی پستول سے اپنے آپ کو مار کر خودکشی کر لی ——— ہٹلر نے اپنی قوم کو بھی ہلاک کیا اور بالآخر خود اپنے آپ کو بھی۔

ہٹلر کا عروج کس طرح ہوا

جدید اقتصادی تاریخ کے بارے میں آپ کوئی کتاب پڑھیں تو آپ کو اس میں ایک اصطلاح عظیم بحران (Great Depression) کی ملے گی۔ اس سے مراد وہ غیر معمولی کساد بازاری ہے جو یورپ اور امریکہ میں ۱۹۲۹ میں شروع ہوئی۔ اور ۱۹۳۹ تک جاری رہی۔ اس زمانہ میں مخصوص اسباب کے تحت صنعتی پیداوار گوداموں میں ڈھیر ہو گئی اور بازار میں ان کے خریدار بہت کم ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کارخانے بند ہو گئے۔ اقتصادی سرگرمیاں ٹھپ ہو گئیں۔ تقریباً ۲۵ فیصد صنعتی کارکن بالکل بے روزگار ہو گئے۔ جرمنی میں بے روزگار آدمیوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ مغربی دنیا کی نصف تجارت برباد ہو کر رہ گئی۔

یہ بحران ابتدائی طور پر اگرچہ اقتصادی تھا، مگر اس کے نہایت اہم سیاسی نتائج برآمد ہوئے۔ انتہا پسند عناصر زیادہ طاقت ور ہوگئے اور اعتدال پسند لوگوں کی ساکھ بہت گھٹ گئی:

The Depression had important consequences in the political sphere, strengthening extremist forces and lowering the prestige of liberal democracy (IV/696)

کسی سماج میں بظاہر سب سے زیادہ طاقت ور ادارہ حکومت کا ہوتا ہے، اس لئے عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی بڑی مصیبت پڑتی ہے تو لوگ اس کو حکمرانوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں عمومی طور پر وقت کے حکمرانوں کے خلاف فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نفسیات کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص مصائب کا ذمہ دار حکومت کو قرار دے اور اس کے خلاف پرجوش تقریریں کرے، وہ لوگوں کو اپنا سچا ہمدرد دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص مجموعی حالات کی روشنی میں مسائل کا تجزیہ کرے وہ لوگوں کی نظر میں "ظالم حکومت" کا ایجنٹ بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کے متعلق لوگوں کا گمان یہ ہو جاتا ہے کہ وہ عوام کو عمل کے اصل نشانہ سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔

زمانۂ بحران (۳۹ - ۱۹۲۹) میں جرمنی کے یہی حالات تھے جس کو ہٹلر نے استعمال کیا۔ اس نے تمام مصیبتوں کا ذمہ دار حکومت وقت کو قرار دے کر اس کے خلاف آتشیں تقریریں شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ جرمنی کا سب سے مقبول لیڈر بن گیا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں ۱۹۲۹ کے بعد پیدا ہونے والے اقتصادی بحران سے ہٹلر کو عوامی تائید ملی۔ اور اس کی پارٹی جرمنی کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی:

Economic depression after 1929 brought mass support, making (1932) Nazis largest party in Reionstag. Hitler was appointed Chancellor (Jan. 1933), established dictatorship in Germany.

دوسری مثال

ایک طرف ہٹلر کی یہ تاریخ ہے۔ دوسری طرف اسی یوروپ میں برطانیہ کی ایک تاریخ ہے۔ برطانیہ میں اس کے بالکل برعکس انداز میں ایک "پارٹی" بنی۔ جو عام طور پر فیبین سوسائٹی کے نام

سے جانی جاتی ہے۔ اس کا طریق فکر اور اس کا انداز اس سے مختلف تھا جو ہٹلر کا اور اس کی نیشنل سوشلسٹ (نازی) پارٹی کا تھا۔ فیبین سوسائٹی برطانیہ میں کبھی عوامی مقبولیت حاصل نہ کر سکی مگر اس نے برطانیہ کے لئے جو کام کیا وہ نازی پارٹی کے مقابلہ میں ہزاروں گنا زیادہ اہم تھا۔

فیبین سوسائٹی لندن میں ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام کی برائیوں کو دور کرنا تھا۔ اس سوسائٹی میں ابتداءً جو لوگ شریک ہوئے ان میں سے ایک جارج برنارڈ شا (۱۹۵۰ — ۱۸۵۶) تھا۔ برنارڈ شا اپنے اندر عوام پسند تقریر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کی تقریروں نے اس تحریک کے گرد ایک بھیڑ جمع کر دی۔ نوجوان برنارڈ شا نے اس کے بعد عوامی مظاہرہ کا منصوبہ بنایا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک جلوس نکالا۔ اس جلوس میں زیادہ تر درمیانی طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ جب مارچ کرتے ہوئے لندن کے ان علاقوں میں پہنچے جہاں بڑے بڑے دولت مند رہتے تھے تو ان کے کچھ افراد تشدد پر اتر آئے اور توڑ پھوڑ کرنے لگے۔

اس پہلے تجربہ کے بعد ہی فیبین سوسائٹی کے رہنما جلوس اور مظاہرہ کے سخت مخالف ہو گئے انھوں نے کہا کہ عوام کو "پر امن مظاہرہ" کا پابند رکھنا انتہائی حد تک مشکل ہے۔ اس لئے ہم اپنی اصلاحی جدوجہد کو مظاہرہ کے بغیر چلائیں گے۔ اس کے بعد فیبین سوسائٹی پریس، اجتماعات، علمی ریسرچ وغیرہ جیسے غیر مظاہراتی طریقوں کی پابند رہ کر کام کرنے لگی۔ فیبین سوسائٹی نے تدریجی طریقۂ کار کی ناگزیریت (Inevitableness of gradualism) پر زور دیا۔ اس تحریک کے لوگ سوشلزم کو مانتے تھے مگر وہ ، ارتقائی سوشلزم کا عقیدہ رکھتے تھے نہ کہ انقلابی سوشلزم کا :

> The Fabians put their faith in evolutionary socialism rather than in revolution (4/20).

غیر مظاہراتی طریق عمل اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ موجودہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس کام میں اپنے آپ کو روکنا پڑتا ہے۔ توسیع کے بجائے استحکام پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ شہرت اور مقبولیت کے مواقع ہوتے ہوئے اپنے آپ کو گمنامی میں دفن کرنے کے لئے راضی ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ فیبین سوسائٹی کے ساتھ یہ سب کچھ پیش آیا۔ یہ ایک حقیقت ہے

کہ فیبین سوسائٹی نے برطانیہ میں ایک زبردست تاریخ بنائی۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برطانی عظمت کو قائم کرنے کے لئے اس کے رہنماؤں کو اپنی ذاتی عظمت سے دست بردار ہو جانا پڑا۔

اپنے معتدل طرز فکر اور اپنے غیر عوامی طریق کار کی فیبین سوسائٹی کو یہ قیمت دینی پڑی کہ وہ کبھی برطانیہ کی مقبول عام تحریک نہ بن سکی۔ ۱۹۴۶ کا زمانہ اس کا عروج کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے۔ مگر اس عروج کے زمانہ میں بھی فیبین سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد ۸۴۰۰ سے زیادہ نہ تھی۔ وہ ہمیشہ "خواص" کی تحریک شمار کی جاتی رہی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فیبین سوسائٹی نے اپنی خاموش فکری سرگرمیوں کے ذریعہ برطانیہ کے ذہین طبقہ پر گہرا اثر ڈالا۔ ملک کی عام آبادی میں اس کے ارکان کی تعداد اگرچہ ایک فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ مگر اعلیٰ ترین اذہان کی قابل لحاظ تعداد اس سے متاثر ہو گئی۔ چنانچہ اس کے ممبروں کی فہرست میں جارج برنارڈ شا، سڈنی ویب اور کلیمنٹ ایٹلی جیسے لوگوں کے نام شامل ہیں۔

فیبین سوسائٹی کے ارکان اگلے مرحلہ میں برطانیہ کی لیبر پارٹی میں شریک ہو گئے۔ یہ لوگ لیبر پارٹی میں اس حد تک دخیل ہوئے کہ وہ اس کا دماغ بن گئے۔ چنانچہ ۱۹۴۵ کے انتخابات میں لیبر پارٹی برطانیہ میں برسراقتدار آئی تو اس کے ممبرانِ پارلیمنٹ کی نصف تعداد وہ تھی جو فیبین سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ پارٹی کے لیڈر کلیمنٹ ایٹلی بھی اس کے ایک ممبر تھے۔ فیبین سوسائٹی ملک کی مجموعی آبادی میں بمشکل ایک فی صد تھی مگر حکمراں پارٹی میں اس کی تعداد پچاس فی صد تک پہنچ گئی۔

۱۹۴۵ سے پہلے برطانیہ میں سرونسٹن چرچل کی پارٹی برسراقتدار تھی۔ اس وقت برطانیہ کے نوآبادیاتی مقبوضات میں آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ بظاہر برطانیہ کی طاقت ان تحریکوں کو دبانے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ مگر چرچل نے برطانی مقبوضات کو آزاد کرنے کا مطالبہ بے نیازانہ طور پر رد کر دیا۔ انھوں نے پارلیمنٹ میں اپنی تاریخی تقریر میں کہا تھا کہ وہ ملک معظم کے وزیر اعظم اس لئے نہیں بنے ہیں کہ سلطنت برطانیہ کے خاتمہ کی تقریب کی صدارت کریں:

He had not become His Majesty's first minister to preside over the liquidation of His Majesty's empire.

ونسٹن چرچل کی پالیسی برطانیہ کو اسی قسم کے انجام کی طرف لے جانے والی تھی جہاں ہٹلر نے جرمنی کو

پہنچا یا تھا۔ یعنی اپنے مقبوضہ ممالک سے پرتشدد جنگ اور بالآخر ظلم کا ٹائٹل لے کر ان کی آزادی پر راضی ہونا۔

مگر ۱۹۴۵ میں جب لیبر پارٹی برسراقتدار آئی تو اس نے اپنے فیبین ممبروں کے زیر اثر پورے معاملہ پر از سر نو غور کرنا شروع کیا۔ ان کے حقیقت پسندانہ انداز فکر نے انھیں بتایا کہ نوآبادیاتی ممالک کو موجودہ حالات میں زیادہ دیر تک اپنے قبضہ میں رکھنا ناممکن ہے۔ جدید حالات کے نتیجہ میں بہر حال ایک نہ ایک دن وہ آزاد ہو کر رہیں گے۔ لیکن اگر برطانیہ پرامن طور پر انھیں آزاد کردے تو یہ اس کے لئے کھونے سے زیادہ پانے کے ہم معنی ثابت ہوگا۔ یہ دراصل فیبین دماغ ہی تھا جس کے تحت برطانیہ نے ۱۹۴۷ میں یہ تاریخی فیصلہ کیا کہ وہ ہندستان کو (اور اس کے بعد دوسرے ممالک کو) پرامن طور پر آزاد کردے۔

اس حقیقت پسندانہ فیصلہ کا زبردست فائدہ برطانیہ کو ملا۔ ایک طرف اس کے عالمی اقتصادی فائدے بڑی حد تک محفوظ رہے۔ دوسری طرف برٹش کامن ویلتھ کی صورت میں اس نے مزید کم از کم نصف صدی تک اپنے عالمی سیاسی وقار کا تحفظ کرلیا۔

ہمارے لئے سبق

ہندستان کے حالات نے اگرچہ اس کی اجازت نہ دی کہ یہاں کوئی شخص "ہٹلر" بن سکے۔ مگر ایک اعتبار سے ہمارے اکثر لیڈر ہٹلر ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ ہمارے ملک کے بیشتر لیڈر خواہ وہ کمیونٹی لیڈر ہوں یا قومی لیڈر، یہی کرتے رہے ہیں کہ وہ فرقہ یا قوم کو پیش آنے والی کسی مصیبت کو لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ بگڑے ہوئے حالات کی پوری ذمہ داری وقت کی حکومت پر ڈال کر اس کے خلاف دھواں دھار تقریریں شروع کر دیتے ہیں۔ جلسہ، جلوس، اخباری بیانات کا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے، اور ان سب کا رخ ہمیشہ حکومت وقت کی طرف ہوتا ہے۔

عوام اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر جوق در جوق ایسے لیڈروں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان کے گرد بہت جلد عوام کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ وقت کی حکومت کا خاتمہ کر دیں۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ کہ حالات پہلے سے بھی زیادہ بدتر ہو جاتے ہیں۔ کسی کا یہ قول اس قسم کے تمام انقلابات پر صادق آتا ہے کہ انقلاب اس بات کی ایک کامیاب کوشش ہے کہ ایک بری حکومت کو ختم کرکے اس سے بھی زیادہ بری حکومت کو اپنے اوپر مسلط کرلیا جائے:

A revolution is a successful effort to get rid of a bad government and set up a worse.

وقت کی ضرورت

آج کی سخت ترین ضرورت یہ ہے کہ ملک میں فیبین سوسائٹی کے طرز کی تحریکیں اٹھائی جائیں، کمیونٹی کی سطح پر بھی اور قومی اور ملکی سطح پر بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے فوراً بعد مہا تما گاندھی نے اسی قسم کی ایک جماعت کا نقشہ پیش کیا تھا اور اس کا نام انھوں نے جن کانگرس رکھا تھا۔ گاندھی جی کا کہنا یہ تھا کہ سیاسی آزادی مل جانے کے بعد اب ہمارے سامنے ملک کی تعمیر کا زیادہ بڑا کام ہے۔ اس لئے ہمیں ایک غیر سیاسی جماعت کی ضرورت ہے۔ اس جماعت کا کام عوام کی ذہنی تربیت ہوگا اور وہ انتخابی سیاست سے الگ رہ کر خالص تعمیری انداز میں کام کرے گی۔ " جن کانگریس " کی کامیابی کے لئے ضروری تھا کہ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر عہدہ اور اقتدار کا راستہ چھوڑ کر خاموش عمل پر اپنے آپ کو راضی کریں اور پوری توجہ کے ساتھ اس میں لگ جائیں۔ مگر کوئی لیڈر اس سیاسی قربانی کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اور گاندھی جی کی موت کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

لاقانونیت کا مسئلہ

مارچ ۱۹۸۸ کی ۱۲ تاریخ ہے۔ اور صبح ۸ بجے کا وقت۔ میرے دفتر (نئی دہلی) سے متصل پارک میں رنگ برنگ کے پھول نہایت حسین منظر پیش کر رہے ہیں۔ اتنے میں کالونی کی ایک خوش پوش عورت پارک میں داخل ہوتی ہے۔ وہ پھول توڑنا چاہتی ہے۔ مالی اس کو منع کرتا ہے۔مگر وہ باز نہیں آتی۔ وہ اپنے کچھ پسندیدہ پھولوں کو توڑ کر ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ اور باہر سڑک پر آکر فاتحانہ انداز میں کہتی ہے : ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باپ کا پارک ہے۔ ہم پھول توڑیں گے ، دیکھیں کون ہم کو روکتا ہے پھول توڑنے سے۔

یہ چھوٹا سا واقعہ اس ہندستان کی تصویر پیش کرتا ہے جس کو آزاد ہندستان کہا جاتا ہے۔ آزاد ہندستان دراصل لاقانونی ہندستان کا دوسرا نام ہے۔ آج ملک کے جس شعبہ کو دیکھئے، ہر جگہ لاقانونیت ہے۔ سرکاری دفتروں سے لے کر سڑک کی ٹریفک تک تعلیمی اداروں سے لے کر سیاسی پارٹیوں تک ، ملک کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں قانون کا احترام پایا جاتا ہو۔ اپنے ذاتی مفاد کے سوا اور کوئی چیز نہیں جس کو لوگ جانتے ہوں۔ اپنی ذاتی انا کے سوا اور کوئی چیز نہیں جس کا لحاظ کرنے کی ضرورت انھیں محسوس ہوتی ہو۔ قانون کی پابندی کرنے والے شہری (Law abiding citizen) نام کی کوئی چیز جدید ہندستان میں نہیں پائی جاتی۔

اس تاثر کے تحت آج جب میں نے دہلی کے اخبارات پڑھے تو مجھے محسوس ہوا کہ اس لاقانونیت کا ڈانڈا دراصل ڈانڈی مارچ سے ملتا ہے۔ آج (۱۲ مارچ ۱۹۸۸) کے اخبارات نے ڈانڈی مارچ کے واقعہ کی تفصیلات نمایاں طور پر شائع کی ہیں۔ ڈانڈی مارچ کیا تھا۔ وہ گویا قانون شکنی کی طرف اکابر قوم کا مارچ تھا۔ یہ قانون شکنی کو گلوریفائی کرنے کے ہم معنی تھا۔ اور جب کسی قوم میں ایک بار قانون شکنی کی روایت قائم کر دی جائے تو پھر وہ کسی حد پر نہیں رکتی۔

ڈانڈی مارچ ہندستان کی تاریخ آزادی کا مشہور واقعہ ہے۔ یہیں سے مہاتما گاندھی کی سول نافرمانی Civil disobedience کا آغاز ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد

پورے ملک میں برٹش راج کے خلاف عوامی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ لوگ بے خوف ہو کر انگریز حکمرانوں کو ہر جگہ چیلنج کرنے لگے۔ انگریزی قانون کو توڑنا قومی ہیرو بننے کے ہم معنی ہو گیا۔ ایک سال کے اندر ۶۰ ہزار آدمی خوشی خوشی جیل چلے گئے۔ وغیرہ۔

مہاتما گاندھی ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ کو سابرمتی آشرم سے پیدل روانہ ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ۷۹ آدمی تھے۔ انھوں نے ۲۴۱ میل کا سفر ۲۴ دن میں طے کیا اور ۵ اپریل ۱۹۳۰ کو ساحل سمندر پر پہنچے۔ انھوں نے وہاں ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر نمک حاصل کر کے قانون شکنی کے عمل کا آغاز کیا۔ اس پورے راستہ میں گاندھی جی کو اطراف کی بستیوں سے اتنا زبردست استقبال ملا جو کسی بادشاہ کے لئے بھی قابل رشک ہو سکتا تھا۔ مہاتما گاندھی ایک ہیرو کی مانند سابرمتی سے ڈانڈی پہنچے۔ وہاں انھوں نے ۵ اپریل ۱۹۳۰ کو اپنے قلم سے لکھا کہ میں طاقت کے خلاف حق کی اس جنگ کے لئے عالمی ہمدردی چاہتا ہوں :

I want world sympathy in this battle of Right against Might.

۱۲ مارچ ۱۹۸۸ کے دہلی کے اخبارات میں ڈانڈی مارچ کے بارے میں اس قسم کی مختلف تفصیلات شائع ہوئی ہیں۔ ان کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ ۶۰ برس پہلے مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھی یہ سمجھتے تھے کہ ملک کا اصل مسئلہ ملک سے برٹش راج کو ختم کرنا ہے۔ مگر اس واقعہ کے ۶۰ برس بعد دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اصل مسئلہ "برٹش راج" کو ختم کرنا نہیں تھا بلکہ "نفسانی راج" کو ختم کرنا تھا۔ برٹش راج ختم ہو گیا مگر نفسانی راج مزید شدت کے ساتھ باقی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پورا ملک پہلے سے بھی زیادہ بے امنی اور بدعنوانی کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ موجودہ ہندستان میں کسی شریف اور با اصول آدمی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اس کے لئے موجودہ ہندستان میں زندہ رہنا ایسا ہی ہے جیسا کانٹوں کے فرش پر زندہ رہنا۔

مہاتما گاندھی کے ساتھ ڈانڈی مارچ (۱۹۳۰) کے قافلہ میں جو لوگ شریک تھے، ان میں سے کچھ افراد بوقت تحریر زندہ ہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر کپل پرساد دیو ہیں جن کی عمر اب ۸۸ سال ہو چکی ہے۔ گاندھی نگر میں انھوں نے ہندستان ٹائمس (۱۲ مارچ ۱۹۸۸) کے نامہ نگار مسٹر اشوک ویاس سے ماضی کی

یادوں کو بتاتے ہوئے کہا کہ ہمارا قافلہ جب چلتے ہوئے سورت پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے ڈانڈی مارچ والوں کے لئے ایک پر تکلف لنچ کا انتظام کیا۔ لوگ شوق سے اس دعوت میں شریک ہوئے اور خوب سیر ہو کر کھایا پیا۔ جب گاندھی جی کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ اس سفر کے دوران ہر شام کو وہ مجلس کرتے تھے۔ اس روز شام کی مجلس میں انھوں نے کہا:

I think I have committed a Himalayan blunder in selecting the Satyagrahis for this kooch. When majority of the countrymen could not get a bajra roti and chatni or onion how could you think of taking such lavish lunch.

میرا خیال ہے کہ میں نے ستیہ گرہیوں کو اس کوچ کے لئے منتخب کرکے ہمالیہ پہاڑ کے برابر غلطی کی ہے۔ ملک کے باشندوں کی اکثریت کو کھانے کے لئے باجرہ کی ایک روٹی اور چٹنی یا پیاز بھی نہیں ملتی۔ ایسی حالت میں آپ لوگوں نے کیوں کر یہ سوچا کہ آپ ایسا پر تکلف کھانا کھائیں۔

مہاتما گاندھی اگر آج زندہ ہوتے تو یقیناً وہ محسوس کرتے کہ سورت کی پر تکلف دعوت کو قبول کرنے سے زیادہ بڑی غلطی خود ڈانڈی مارچ کا فیصلہ تھا جو قانون شکنی یا سول نافرمانی (Civil Disobedience) کے طور پر زیر عمل لایا گیا تھا۔ جدید ہندستان میں سب سے پہلی ہمالیائی غلطی یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف "نافرمانی" کے طریقہ پر عمل کرکے قانون شکنی کی روایت قائم کی گئی۔ کسی ملک کے اکابر جب ایک بار قانون کے احترام کی روایت کو توڑ دیں اور قانون شکنی کو مقدس قومی عمل کی حیثیت سے رائج کریں تو اس کے بعد ملک کو لاقانونیت (Lawlessness) کی طرف جانے سے روکا نہیں جا سکتا۔ اور آزادی کے بعد کا ہندستان، جہاں لاقانونیت ہی کا نام قانون ہے، بلاشبہہ اسی غلطی کا نتیجہ ہے جس کا آغاز ۶۰ سال پہلے تمام اکابر قوم کی متفقہ منظوری سے کیا گیا تھا۔

مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۷ سے پہلے برٹش راج کو ختم کرنے کے لئے تحریک چلائی تو سارا ہندستان ان کے ساتھ ہو گیا۔ وہ ملک کے ہیرو بن گئے۔ مگر اسی مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۷ کے بعد نفسانی راج کو ختم کرنے کی مہم شروع کی تو انھیں آزاد ہندستان کے عین قلب میں گولی مار کر ختم کر دیا گیا ——— احتساب غیر کے عنوان پر لیڈر بننا کتنا آسان ہے اور احتساب خویش کے عنوان پر لیڈر بننا کتنا مشکل۔

تعمیر قوم کی ضرورت

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو مہاتما گاندھی کا قتل ہوا تو اس وقت میں اعظم گڑھ میں تھا۔ اگلے دن شہریوں کی طرف سے ایک جلسہ ہوا جس میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ مقامی ایس کے پی کالج کے ہندو پرنسپل نے اس موقع پر جو تقریر کی تھی وہ اب تک مجھے یاد ہے۔ انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کے قتل کے واقعہ پر مختلف اخبارات نے اپنے اپنے انداز میں سرخی لگائی ہے۔ مگر مجھے امرت بازار پتریکا کی سرخی سب سے زیادہ پسند آئی جو اس طرح تھی:

Gandhi sacrificed by fanaticism

(گاندھی جنونیوں کے ہاتھوں ھلاک) اس میں شک نہیں کہ مہاتما گاندھی کے حادثہ کے بارے میں یہ صحیح ترین سرخی تھی۔ آزادی کے بعد ہندستان میں دو رجحانات کا مقابلہ تھا ——— گاندھی ازم اور فنیٹزم۔ اس مقابلہ میں فنیٹزم کو کامیابی ہوئی، گاندھی ازم ناکام ہو کر رہ گیا۔

ملک کی تقسیم بلاشبہ غلط تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ غلط بات یہ تھی کہ تقسیم کے بعد لوگ اس کے رد عمل سے اپنے آپ کو بچا نہ سکے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ آزادی کے بعد ہندوؤں کی ایک جماعت مہاتما گاندھی کی سخت مخالف ہوگئی۔ اس نے مہاتما گاندھی کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اولاً مدن لال نے مہاتما گاندھی پر دستی بم پھینکا مگر وہ نشانہ پر نہیں پہنچ سکا۔ اس کے بعد اس کے ساتھی ناتھورام گوڈسے نے پستول کی گولی سے مہاتما گاندھی کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد ۹ آدمیوں پر مقدمہ چلایا گیا جو ۶ ماہ سے زیادہ مدت تک جاری رہا۔ اس موقع پر بیان دیتے ہوئے مدن لال نے جو کچھ کہا تھا ان میں سے ایک یہ تھا کہ اس کو اس بات کا غصہ تھا کہ مہاتما گاندھی کے اصرار پر ہندستانی حکومت نے پاکستان کو اس کے حصہ کا ۵۵ کرور روپیہ دے دیا۔ اس واقعہ نے گوڈسے کو مشتعل کر دیا:

Madan Lal said he was angered by the Indian Union's payment of 550,000,000 rupees to Pakistan. This exasperated Godse.

Louis Fischer, *The Life of Mahatma Gandhi*
Harper & Row Publishers, 1983, New York, p.504

آزادی کے بعد صرف ساڑھے چار مہینہ کے اندر پیش ہونے والا یہ واقعہ ملک کے لئے ایک چیلنج

تھا ــــــ وہ مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے اصول پر چلے یا قوم پرست جنونیوں کے آگے جھک جائے۔ ملک کی قیادت نے ابتداءً یہ فیصلہ کیا کہ اس کو مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے اصولی راستہ پر چلنا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق ملک کا دستور بنایا گیا۔ اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۶ کو اس کے باقاعدہ نفاذ کا اعلان کر دیا گیا۔

اب بظاہر ملک کے مستقبل کی تعمیر دستور ہند کی رہنمائی میں ہونی چاہئے تھی۔ مگر یہاں ایک رکاوٹ پیش آ گئی۔ دستور ساز اسمبلی کے ارکان نے پارلیمنٹ ہاؤس کی چھت کے نیچے بیٹھ کر جو کچھ کاغذ پر لکھا تھا وہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر نہ لکھا جا سکا۔ کاغذی دفعات کے مطابق ملک کا مذہب سیکولرزم تھا، مگر عوامی رجحان کے مطابق ملک کا مذہب بدستور فنیٹسزم (مجنونانہ قوم پرستی) بنا رہا۔ اس تضاد کا اظہار پچھلی تقریباً نصف صدی کے دوران مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ہے۔

یہ صورت حال ملک کے لیڈروں کے لیے سخت آزمائش تھی۔ کاغذ کے اوپر خوبصورت دفعات لکھنے کے لئے بازار کی سیاہی کافی ہے۔ مگر زندگی میں ان دفعات کے عملی نفاذ کے لئے اس قربانی کی ضرورت تھی جس کو ڈیگال کے نام پر گال ازم کہا جاتا ہے۔ ہمارے لیڈروں نے پہلا کام تو کیا، مگر وہ دوسرا کام نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ دستور ہند کے الفاظ ملک کی حقیقی زندگی میں واقعہ نہ بن سکے۔

ملک میں جو دستور بنایا گیا تھا وہ حقیقۃً ارکان اسمبلی کی سطح پر بنایا گیا تھا وہ وسیع تر سطح پر عوامی رجحانات کا نمائندہ نہ تھا۔ اس لئے بہت جلد دونوں کے درمیان ٹکراؤ پیش آ گیا۔ دستور کے الفاظ شہریوں کے درمیان مساوات کا اعلان کر رہے تھے۔ مگر ملکی عوام تعصب اور امتیاز کے راستہ پر چلتے رہے۔ دستور کے الفاظ ہر ایک کے لئے یکساں انصاف کی ضمانت دے رہے تھے مگر عوامی رجحان کا تقاضا تھا کہ اپنوں کے ساتھ ایک سلوک کیا جائے اور غیروں کے ساتھ دوسرا سلوک۔

یہاں ملکی حکمرانوں کو دستور کا ساتھ دینا تھا نہ کہ عوامی خواہشات کا۔ مگر انھوں نے دیکھا کہ اگر وہ دستور ہند کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں تو وہ اپنے حق میں عوام کی سیاسی حمایت کھو دیں گے، اگلے الکشن کے موقع پر انھیں عوام کا ووٹ حاصل نہ ہو سکے گا۔ وہ عوامی خواہشات کے آگے جھک گئے اور دستور کو پس پشت ڈال دیا۔ اگرچہ یہ دستور وہی تھا جس کے ساتھ وفاداری کا حلف لے کر وہ حکومت کے ایوان میں داخل ہوئے تھے۔

باب پنجم

اسلام ایک ابدی مذہب ہے۔ جس طرح سورج ہر
زمانہ میں چمکتا ہے اسی طرح اسلام کی رہنمائی بھی
ابدی طور پر قائم ہے۔

اسلام کا رول

اسلام کا تاریخی رول اتنا عظیم ہے کہ ایک مورخ نے اس کو تمام معجزات سے بڑا معجزہ (miracle of all miracles) قرار دیا ہے۔ جن اہل علم نے بھی اس مسئلہ کا بے لاگ مطالعہ کیا ہے انھوں نے غیر معمولی انداز میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انسانی تاریخ میں اسلام کا رول اتنا عظیم رہا ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام کے ظہور سے پہلے پچھلے تمام معلوم زمانوں میں انسان کسی بھی میدان میں کوئی بڑی ترقی نہ کر سکا۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی ترقیاں اسلام کے بعد ظہور میں آئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی کے ذریعہ پہلی بار انسانی ترقیوں کے وہ تمام دروازے کھلے جو ہزاروں سال سے بند پڑے ہوئے تھے۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلام خدا کا بھیجا ہوا وہ دین ہے جو آج بھی مکمل طور پر اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔ یہ دین کائنات میں قائم شدہ فطرت کے وسیع تر نظام سے کامل مطابقت رکھتا ہے۔ خالق کائنات نے اسلام کی صورت میں وہ تمام بنیادی اصول ہمیں دے دئے ہیں جو خدا کی اس دنیا میں زندگی کی تعمیر کے لئے صحیح ترین اساس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام وہ صالح انقلاب لانے میں کامیاب ہوا جو اب تک ممکن نہیں ہوا تھا۔

یہ معاملہ دراصل صحیح آئیڈیالوجی اور غلط آئیڈیالوجی کا معاملہ ہے۔ اس دنیا میں صرف دو قسم کی آئیڈیالوجی ممکن ہے۔ ایک ہے، توحید پر مبنی آئیڈیالوجی اور دوسری، شرک والحاد پر مبنی آئیڈیالوجی۔ اول الذکر حقیقی ہے اور ثانی الذکر غیر حقیقی۔ اسلام سے پہلے ہزاروں سال سے دنیا میں غیر موحدانہ تصور حیات پھیلا ہوا تھا۔ اس غیر حقیقی تصور نے انسانیت کے اوپر ہر قسم کی ترقیوں کو روک رکھا تھا۔ اسلام نے تاریخ میں پہلی بار یہ کیا کہ عظیم جدوجہد کے ذریعہ غیر موحدانہ تصور کی بالادستی ختم کر دی اور اس کی جگہ موحدانہ تصور حیات کو فکری و عملی برتری دے

دی۔ اس تاریخی انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کے اوپر ترقی کے وہ تمام راستے کھل گئے جو اب تک اس کے لئے بند پڑے ہوئے تھے۔

اس اسلامی انقلاب کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس کا تعلق انسانی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں سے ہے۔ یہاں ہم اس کے صرف چند پہلوؤں کا نہایت مختصر ذکر کریں گے تاکہ اسلام کی اس خصوصیت کا اجمالی اندازہ ہو سکے۔

مذہبی اصلاح

مذہب انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ انسان پیدائشی طور پر ایک مذہب چاہتا ہے۔ مگر وہ اسلام سے پہلے اپنی صحیح اور فطری صورت میں انسان کے پاس موجود نہ تھا۔ اسلام نے انسان کو صحیح اور فطری مذہب عطا کیا۔

اسلام سے پہلے جو مذہبی نظامات دنیا میں موجود تھے، ان کے مطابق انسان براہ راست خدا تک نہیں پہونچ سکتا تھا۔ انسان کے لئے صرف یہ ممکن تھا کہ وہ مخصوص مذہبی طبقہ (کلرجی) یا مفروضہ مقرب شخصیتوں کے واسطہ سے خدا کے ساتھ اپنا رشتہ قائم کرے۔ یہ صورت حال فطری تقاضہ کے خلاف تھی۔ کیونکہ انسان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ وہ بلا واسطہ خدا سے مل سکے۔ اسلام نے اس انسانی تقاضے کی تکمیل کی۔ قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ ـــــ اور جب میرے بندے تم سے میری بابت پوچھیں تو میں نزدیک ہوں۔ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ تو چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ وہ ہدایت پائیں۔ (البقرہ ۱۸۶)

یہی معاملہ عبادات کا تھا۔ قرآن میں قدیم اہل عرب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: "اور بیت اللہ کے پاس ان کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ (الانفال ۳۵) اس زمانہ میں پوری مذہبی دنیا کا حال یہ تھا کہ عبادت کے ظاہری ڈھانچہ کو اس کی داخلی روح سے الگ کر دیا گیا تھا۔ مزید بگاڑ کے نتیجہ میں عبادت کا ڈھانچہ بھی اپنی اصل صورت میں باقی نہ تھا۔ اسلام نے عبادات کے نظام کو اس کی اصل روح کے ساتھ زندہ کیا۔

یہی معاملہ اخلاق کا تھا۔ کچھ نمائشی عادات واطوار کو اخلاق سمجھ لیا گیا تھا۔ اسلام نے اخلاقی نظام کی تکمیل کی۔ اخلاق کو اس کی حقیقی اسپرٹ کے ساتھ زندہ کیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کی صورت میں اخلاق کا ایک زندہ عملی نمونہ قائم کیا۔ مزید یہ کہ اخلاق کو سماجی سلوک سے اوپر اٹھا کر اس کو ربانی سلوک کا درجہ عطا کیا۔

اسی طرح اجتماعی اور سیاسی نظام کی تشکیل میں اسلام کا نہایت اہم حصہ ہے۔ اسلام سے پہلے ساری دنیا میں بادشاہت کا نظام قائم تھا۔ اس نظام کے تحت سیاسی اور اجتماعی معاملات زیادہ تر ایک حکمراں کی مرضی کے تابع سمجھے جاتے تھے۔ اسلام نے اجتماعی اور سیاسی معاملات کو اس کے بجائے خدا کے حکم کے تابع کیا۔ اسی کے ساتھ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب نے اجتماعی معاملات اور ریاستی نظام کا ایک صالح نمونہ قائم کر دیا جو لوگوں کے لئے عملی نمونہ کا کام دیتا رہے۔

اسلام نے ایک طرف ان امور کی اصلاح کی جو خالص مذہبی امور سمجھے جاتے ہیں۔ دوسری طرف زندگی کے بقیہ معاملات کو مذہب کے صالح اصولوں کی بنیاد پر قائم کیا۔ اس طرح اسلام نے انسان کی پوری زندگی کو خدا کے رنگ میں رنگ دیا۔ اب انسان کی پوری زندگی، اپنے تمام شعبوں کے ساتھ، خدا کی عبادت بن گئی۔

سیکولر علوم کی بنیاد آزادانہ ریسرچ پر قائم کرنا

پیغمبر اسلام ﷺ مکہ میں پیدا ہوئے جہاں کھجور کے درخت نہیں ہوتے تھے۔ نبوت کے تیرہویں سال آپ وہاں سے ہجرت کر کے مدینہ آگئے۔ مدینہ میں کثرت سے کھجور کے درخت پائے جاتے تھے۔ ایک روز جب کہ آپ شہر کے باہر چل رہے تھے، آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھجور کے درختوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ اس وقت وہ کام کر رہے تھے جس کو عربی میں تابیر یا تلقیح کہا جاتا ہے۔ یعنی مصنوعی زرخیزی (Pollination)۔ ان لوگوں نے آپ کے پوچھنے پر بتایا کہ ہم ایسا اور ایسا کر رہے ہیں۔ آپ نے ظن کی بنیاد پر ایک بات کہی جس کا مطلب انھوں نے یہ سمجھا کہ آپ اس عمل سے منع فرما رہے ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے تلقیح (زرخیزی) کے اس عمل کو چھوڑ دیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال کھجور کی فصل کم آئی اور جو آئی وہ بھی خراب تھی۔ آپ نے دریافت کیا کہ اس سال کھجور کی فصل خراب کیوں ہوئی۔ لوگوں نے جواب دیا کہ ہمارے تجربہ کے مطابق، اچھی فصل کا انحصار اسی عمل پر ہوتا ہے جو ہم کر رہے تھے اور آپ نے اس سے منع فرمادیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ سن کر کہا کہ جو تم کر رہے تھے اس کو کرو کیوں کہ تم اپنی دنیا کے معاملہ کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ انتم اعلم بأمر دنیا کم (مسلم ۱۵/۱۱۸)

یہ ایک بے حد اہم رہنمائی تھی جو تاریخ میں پہلی بار پیغمبر اسلام نے جاری فرمائی۔ اس رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سائنسی ریسرچ اور فطرت کے رازوں کی دریافت کا وہ سلسلہ انسانوں کے درمیان کھلے طور پر جاری ہو گیا جو ہزاروں سال سے رکا ہوا تھا۔

قدیم زمانہ میں علمی تحقیق کی حیثیت ایک آزادانہ شعبہ کی نہ تھی۔ اس زمانہ میں علمی تحقیق کو مذہبی عقائد ورسوم کے تابع بنادیا گیا تھا۔ کوئی علمی دریافت اسی وقت صحیح سمجھی جاتی تھی جب کہ وہ مروجہ عقائد ورسوم سے مطابقت رکھتی ہو، اگر وہ اس کے مطابق نہ ہو تو بلا بحث اس کو رد کر دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں ہزاروں سال تک علمی تحقیق کا کام اپنے ابتدائی مرحلہ میں رکا رہا۔ وہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے مذکورہ انقلابی اعلان کے بعد تاریخ میں ایک نیا دور آیا۔ اب نہ صرف باغبانی اور زراعت بلکہ علومِ فطرت کے ہر شعبہ میں آزادانہ تحقیق ہونے لگی۔ ہر علم بے روک ٹوک آگے بڑھنے لگا۔

یہی وجہ ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ کے مسلمانوں نے زراعت و باغبانی کے نئے نئے طریقے دریافت کئے۔ انہوں نے صنعت و تعمیر کے میدان میں زبردست ترقی کی۔ جراحی سے لے کر جنگ تک ہر شعبہ میں نئے نئے آلات اور اوزار بنائے۔ آزادانہ تحقیق کی یہ لہر بڑھتی رہی یہاں تک کہ صدیوں کے عمل کے دوران وہ ساری دنیا میں پھیل گئی۔ یہی وہ تاریخی عمل ہے جو ترقی کرتے ہوئے اس نئے دور تک پہنچا ہے جس کو ہم سائنس اور ٹکنالوجی کا دور کہتے ہیں۔

عقیدہ اور مادیات کی علحدگی

پیغمبر اسلام ﷺ نے مذاہب کی تاریخ میں پہلی بار یہ کارنامہ انجام دیا کہ آپ نے عقیدہ کو مادیات سے الگ کر دیا۔ مذہبی عقیدہ کی بنیاد آپ نے خدائی شریعت پر رکھی اور مادی شعبوں کے بارے میں انسان کو آزادی دے دی کہ تم سائنسی انداز میں اس پر ریسرچ کرو اور ریسرچ کے ذریعہ جو بات ثابت ہو اس کو اختیار کرلو۔

مقدس عقیدہ کو مادی شعبوں سے الگ کرنا کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ دراصل مادی ترقی کے عمل میں حائل رکاوٹ کو دور کر دینے کے ہم معنی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ زراعت اور باغبانی جیسے شعبے قانون فطرت کے تحت ہیں نہ کہ قانون شریعت کے تحت۔ انسانی زندگی کی تشکیل بلاشبہ شرعی قانون کے تحت ہونی چاہئے۔ مگر زراعت اور باغبانی، انجینیرنگ اور تعمیرات، مشین سازی اور کارخانہ سازی، اس قسم کے مادی شعبے جو فطرت کے قانون پر مبنی ہیں، ان کو اس طرح قائم کیا جائے گا کہ ان کے بارے میں آزادانہ ریسرچ کی جائے گی اور تجربات کئے جائیں گے۔ آزادانہ ریسرچ اور تجربات کے ذریعہ جو طریقہ مفید ثابت ہو اس کو درست مان کر اختیار کر لیا جائے گا۔

مادی شعبوں کی تعمیر کے لئے یہی واحد کارگر اصول ہے۔ موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ مذہب کو ذاتی عقیدہ کی چیز مانا جائے۔ ہر آدمی کو آزادی ہو کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کو اپنے پسندیدہ مذہب کے مطابق بنائے۔ اگر کسی سماج میں تمام کے تمام لوگ ایک مذہب کو ماننے والے ہوں تو وہاں قانون اور اقتصادیات اور سیاسیات کے شعبوں کو بھی مذہب کے دائرہ میں لانا ممکن ہو جائے گا۔

لیکن جہاں تک مادی شعبوں کا تعلق ہے، ان میں مذہبی عقیدہ کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ مثلاً زمینی ذخائر کا استعمال، شہری منصوبہ بندی، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر، کارخانہ بنانا اور کمیونی کیشن کا نظام قائم کرنا۔ سفر کے لئے سواریوں کا انتظام کرنا، اس قسم کی تمام چیزیں سائنس اور ٹکنالوجی

سے تعلق رکھتی ہیں نہ کہ مذہبی عقیدہ سے۔

کوئی شخص اگر سرسوتی کو علم کی دیوی مانتا ہے تو اپنے گھر میں وہ اس کی پرارتھنا کر سکتا ہے۔ مگر تعلیمی اداروں میں اس کی پرارتھنا ایک سراسر غیر مفید بات ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے الکٹرانک میڈیا میں "غریبی ہٹاؤ غریبی ہٹاؤ" کا ٹیپ بجا کر کوئی شخص یہ سمجھے کہ ملک کی غریبی ختم ہو جائے گی۔ دنیا میں جن ملکوں نے علم کے میدان میں بڑی بڑی ترقیاں کی ہیں ان میں سے کوئی بھی ملک نہیں جو علم کی دیوی کے گیت گا کر ترقی یافتہ بن گیا ہو۔ ہر ایک نے خالص سیکولر انداز میں اپنا تعلیمی پروگرام بنایا، اس نے مکمل طور پر فن تعلیم کی روشنی میں اپنا منصوبہ بنا کر یہ کامیابی حاصل کی۔ اس قسم کے شعبوں میں مذہبی عقیدے کو دخل دینا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ سرے سے خود مطلوب ترقی حاصل نہ ہو سکے۔

توہمات کا خاتمہ

صحیح البخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں ایک روایت آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدنی دور میں ایک بار سورج گرہن کا واقعہ پیش آیا۔ اتفاق سے اسی دن پیغمبر اسلام ﷺ کے کم سن صاحبزادہ ابراہیم کی وفات ہوئی۔ چونکہ اس زمانہ میں گرہن کے بارے میں ایک عقیدہ یہ تھا کہ بڑے لوگوں کی موت پر سورج گرہن، چاند گرہن پیش آتے ہیں، اس بنا پر وہاں کے لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ آج کے دن چونکہ پیغمبر کے صاحبزادہ کی وفات ہوئی ہے اس لئے یہ سورج گرہن پیش آیا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ تیزی سے مدینہ کی مسجد میں پہنچے۔ آپ نے وہاں لوگوں کو جمع کیا۔ اس کے بعد لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کسی کی موت یا زندگی کی بنا پر واقع نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں ۔ پس جب تم سورج گرہن یا چاند گرہن کو دیکھو تو عبادت کرو۔ اور اللہ سے دعا کرو۔ اس کے بعد آپ نے مسجد میں جماعت کے ساتھ لمبی نماز ادا کی اور دعا فرمائی۔ (صحیح البخاری، کتاب الکسوف)

یہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ ایک انقلابی اعلان تھا جو تاریخ میں پہلی بار کیا گیا۔ قدیم زمانہ میں ہزاروں سال سے توہماتی افکار کا غلبہ تھا۔ انھیں میں سے ایک یہ تھا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں عجیب قسم کے بے بنیاد نظریات رائج تھے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ آسمان میں ایک بہت بڑا اژدھا ہے۔ وہ غصہ ہو کر سورج اور چاند کو نگلنے کی کوشش کرتا ہے، اس سے گرہن واقع ہوتا ہے۔ کچھ اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جب کوئی بڑا آدمی مرتا ہے تو اس کے اثر سے سورج اور چاند کو گرہن لگ جاتا ہے، وغیرہ۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے پہلی بار انسان کو یہ بتایا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کا ان توہماتی نظریات سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ صرف فطرت کے مظاہر ہیں اور وہ معلوم فلکیاتی قوانین کے تحت واقع ہوتے ہیں۔ اس طرح پیغمبر اسلام نے انسان کو توہماتی طرز فکر کے دور سے نکالا اور اس کو سائنسی طرز فکر کے دور میں داخل کر دیا۔ اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ فطرت کے مظاہر پر سائنسی انداز میں غور و فکر کیا جائے۔ اور فرضی قیاسات کے بجائے حقیقی اسباب کی روشنی میں نظریات قائم کئے جائیں۔

اسی انقلابی رہنمائی کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے درمیان وہ بے شمار توہمات نہیں پھیلے جو ہزاروں سال سے دنیا میں چلے آرہے تھے۔ اس کے نتیجہ میں سب سے پہلے یہ ہوا کہ مسلم سماج حقیقت پسندانہ سماج بن گیا۔ اس کے بعد جب مسلمان عرب سے نکل کر دنیا کے مختلف ملکوں میں گئے تو یہ غیر توہماتی فکر ہر جگہ پھیل گیا۔ یہ تاریخی عمل مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں وہ چیز ظہور میں آئی جس کو سائنسی طرز فکر کہا جاتا ہے، اور جو تمام علمی اور مادی ترقیوں کی فطری بنیاد ہے۔

علم کی عمومی اشاعت

اسلام سے پہلے کسی بھی زمانہ میں علم کی عمومی اشاعت نہ ہو سکی۔ قدیم زمانہ کی پوری معلوم تاریخ علم کی عمومی اشاعت سے خالی ہے۔ اس زمانہ میں مختلف مقامات پر کچھ ایسے افراد

ضرور پیدا ہوئے جنھوں نے علمی تحقیق میں دلچسپی لی مثلاً یونان، مصر، شام، انڈیا، چین، وغیرہ۔ انھوں نے اپنی علمی دریافتوں کو کتابوں کی صورت میں قلم بند کیا مگر یہ کتابیں عمومی طور پر پھیل نہ سکیں۔ وہ انفرادی دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں مذہب اور کلچر کا جو ڈھانچہ تھا وہ مکمل طور پر توہماتی روایات پر مبنی تھا۔ ہر قوم توہماتی عقائد میں جی رہی تھی۔ ایسی حالت میں لوگ علمی تحقیقات سے ڈرتے تھے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر سمجھتے تھے کہ اگر کوئی نئی تحقیق سامنے آگئی تو ان کا توہماتی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اس بنا پر وہ علمی تلاش و جستجو کے سخت مخالف بنے رہے۔

اسلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مذہب کو توہماتی اجزاء سے پاک کیا۔ اس نے مذہب کو توہمات کے بجائے فطرت کے اٹل قوانین پر قائم کیا۔ اس مذہبی انقلاب نے اہل اسلام کو اس ذہنی پیچیدگی سے پاک کر دیا جس میں پچھلے لوگ مبتلا رہتے تھے۔ اب ان کو یہ خطرہ نہیں رہا کہ کوئی علمی دریافت ان کے مذہب کو غلط ثابت کر دیگی۔ وہ اس یقین میں جیتے تھے کہ ہر علمی دریافت اسلام کے مطابق ثابت ہوگی کیوں کہ جو اسلام ہے وہی فطرت ہے، اور جو فطرت ہے وہی اسلام ہے۔

اس یقین نے اہل اسلام کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ساری دنیا کے علوم کو حاصل کریں۔ اس مقصد کے تحت ہر جگہ کی علمی کتابوں کا عربی ترجمہ کرنے کے لئے بڑے بڑے مراکز قائم ہوئے۔ ان میں سے بغداد کا بیت الحکمت (۸۳۰ء) اور قاہرہ کا دار الحکمت (۱۰۰۵ء) زیادہ مشہور ہیں۔ اس زمانہ میں دنیا بھر کی علمی کتابوں سے استفادہ کرنا ایک عمومی تحریک بن گیا۔ امراء اور حکام نے بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے اپنے وفود دنیا کے مختلف شہروں میں بھیجے اور وہ علمی ذخیرے جو گھروں اور کتب خانوں میں بند پڑے ہوئے تھے ان کو حاصل کر کے ان کے ترجمے عربی زبان میں کرائے۔

اس طرح یہ قدیم علوم پہلے مسلمانوں کے درمیان پھیلے۔ اس کے بعد یہ علوم مسلمانوں کی

پیش قدمی کے ساتھ دوسرے ملکوں میں داخل ہوئے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں نے جب اسپین میں سلطنت قائم کی تو یہ عربی کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں۔اس طرح یہ علوم افریقہ اور ایشیااور یورپ کی پوری آباد دنیامیں پھیل گئے۔

جبر کا خاتمہ اور آزادی کا آغاز

قدیم زمانہ میں ساری دنیامیں جبر کا نظام قائم تھا۔ ہر ملک میں نسلی بادشاہی کارواج تھا۔ بادشاہ اپنے اقتدار کو مستحکم رکھنے کے لئے جبر کی فضا کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ انسانی آزادی کے تصور کو فروغ دینے میں مستقل رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔اس زمانہ میں ہر جگہ یہ ماحول قائم تھاکہ سوچنا حکمراں کاکام ہے، بقیہ لوگوں کاکام صرف یہ ہے کہ وہ تابعداری کی زندگی پر قانع رہیں۔

علمی اور فکری ترقی ہمیشہ آزادی کے ماحول میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اس جابرانہ نظام کے تحت انسان کا علمی اور فکری ارتقا بھی مسلسل رکا رہا۔ مثال کے طور پر رومن ایمپائر نے دنیا کے بڑے حصہ پر دوہزار سال تک حکومت کی۔ اس کی سلطنت کا رقبہ یورپ، ایشیا، افریقہ کے بیشتر آباد حصہ پر پھیلا ہوا تھا۔ تاہم دوہزار سال کی اس مدت میں کوئی بھی قابل ذکر علمی اور فکری ارتقا ممکن نہ ہوسکا۔

اسلام نے اس جبری نظام کے خلاف تحریک شروع کی۔ یہ آواز وقت کے حکمرانوں کو پسند نہیں آئی۔ چنانچہ پہلے ہی دور میں اہل اسلام کا مقابلہ اس زمانہ کی دو سب سے بڑی سلطنتوں، رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر سے پیش آگیا۔ یہ مقابلہ اپنی آخری متشددانہ حد تک پہنچ گیا۔اس مقابلہ میں آخر کار اہل اسلام کی جیت ہوئی۔ اور یہ دونوں سلطنتیں اور اسی کے ساتھ ان کی حلیف حکومتیں ہمیشہ کے لئے صفحۂ سیاست سے مٹ گئیں۔ مورخین نے عام طور پر اعتراف کیا ہے کہ اسلام نے اگر رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کو توڑا نہ ہوتا تو انسانی تاریخ میں آزادی کا دور شاید کبھی نہ آتا۔

اسلام کا لایا ہوا آزادی کا یہ انقلاب بھی ایک تاریخی عمل (historical process) کی

صورت میں قوموں کے درمیان جاری رہا۔ فطرت کے قانون کے مطابق، اس پر مختلف نشیب وفراز آتے رہے۔ لیکن کوئی بھی چیز اس عمل کو روک نہ سکی۔ انسانی آزادی کا یہ دھارا مسلسل آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ بیسویں صدی میں وہ اپنی تکمیل تک پہنچ گیا۔ اب مختلف اسباب کے تحت انسانی آزادی ایک ایسا مسلّم اجتماعی اصول ہے جس کی تردید کسی کے لئے ممکن نہیں۔

اخلاقیات کی تکمیل

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ: بعثت لاتمم حسن الاخلاق (موطا امام مالک ۱۶۵)۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ انسانی سماج میں پہلی بار جس نے اخلاق کا حقیقی نظام قائم کیا وہ اسلام ہی تھا۔ اسلام نے پہلی بار اخلاقیات کے لئے بنیاد فراہم کی۔

قدیم زمانہ میں اخلاق کا کوئی عمومی معیار قائم نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاق کے لئے ایک مددگار نظریہ درکار ہوتا ہے، اور قدیم زمانہ میں اخلاق کے حق میں کوئی موثر قسم کا اخلاقی نظریہ موجود نہ تھا۔

یونانی فلسفیوں نے یہ کہا تھا کہ زندگی ابتداءً نباتات کی صورت میں پیدا ہوئی۔ اس کے بعد وہ حیوانات کے دور میں داخل ہوگئی۔ اور پھر انسان کی صورت میں وہ تکمیل تک پہنچی۔ اسی نظریہ کو موجودہ زمانہ میں چارلس ڈارون نے زیادہ سائنٹفک انداز میں پیش کیا جس کو حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت انسان کی حیثیت ایک محترم شخصیت کی نہیں رہتی، وہ ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسے کوئی درخت یا حیوان۔ ایسی حالت میں ایک انسان کے اندر دوسرے انسان کے لئے اعلیٰ اخلاقی جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔

دوسرا نظریہ وہ تھا جس کو ہندستان میں آواگون کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق ہر انسان اپنے پچھلے جنم کا پھل پا رہا ہے، یعنی وہ جیسا ہے ویسا ہی اس کو اپنے پچھلے جنم کی بنا پر ہونا چاہئے۔ اس نظریہ میں بھی رحم کا عنصر ختم ہو جاتا ہے جو اخلاقیات کی لازمی بنیاد ہے۔

تیسرا عمومی نظریہ جو تاریخ کے ہر دور میں رائج رہا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ جب کوئی مرتا ہے تو اسی وقت وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔ یہ نظریہ بھی اخلاقیات کے لئے کوئی موثر بنیاد نہیں۔ اس قسم کا نظریہ صرف وہ چیز پیدا کر سکتا ہے جس کو استحصال (exploitation) کہا جاتا ہے۔

اسلام نے ان سب کے بجائے احتساب (accountability) کا تصور دیا جو اخلاق کے حق میں یقینی طور پر ایک مددگار نظریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام نے بتایا کہ انسان مرنے کے بعد خدا کی عدالت میں پیش ہوگا اور وہاں اپنے موجودہ اخلاقی عمل کے مطابق سزا یا انعام پائے گا۔ یہ نظریہ اخلاق کے حق میں ایک طاقتور محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی انقلاب کے بعد جو اخلاقی سماج بنا ویسا سماج اس سے پہلے دنیا میں نہیں بنا تھا۔

پرامن جدوجہد کی تعلیم

قدیم زمانہ میں کسی بڑے مقصد کے حصول کے لئے انسان صرف ایک ہی طریقہ کو جانتا تھا، اور وہ مسلح جدوجہد ہے۔ اسلام نے تاریخ میں پہلی بار پرامن جدوجہد کا تصور رائج کیا اور اس کی ایک کامیاب عملی مثال بھی تاریخ میں قائم کر دی جو ابدی طور پر لوگوں کے لئے ایک ماڈل کا کام دے۔

قرآن میں پیغمبر اسلام کو حکم دیتے ہوئے کہا گیا کہ —— اور تم قرآن کے ذریعہ جہاد کرو، بڑا جہاد (وجاهد هم به جهاداً كبيرا) قرآن صرف ایک کتاب ہے نہ کہ کوئی شمشیر۔ اس لئے اس حکم کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ تم اپنی جدوجہد کے لئے پرامن طریقہ (peaceful method) کو اپناؤ۔ غیر متشددانہ ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے اپنے مشن کو کامیابی تک پہنچاؤ۔

اسی بات کو قرآن میں دوسری جگہ اس طرح کہا گیا ہے کہ "وتواصوا بالحق، وتواصوا بالصبر" تم ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو

یعنی حق کے لئے صبر کرتے ہوئے جدوجہد کرو۔ دوسرے لفظوں میں، اس سے مراد پرامن جدو جہد ہے۔ کیوں کہ صبر کے بغیر پرامن جدوجہد نہیں ہو سکتی۔

یہی بات حدیث میں بھی مختلف انداز میں بتائی گئی ہے۔ مثلاً صحیح البخاری کی ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔ (ان اللہ یعطی علیٰ الرفق مالا یعطی علیٰ العنف) لفظ بدل کر دیکھا جائے تو یہ عین وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں نان وائلنٹ ایکٹوزم (non-violent activism) یا پیس فل ایکٹوزم (peaceful activism) کہا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنا مشن عین اسی اصول پر چلایا اور اس کو آخری تکمیل تک پہنچایا۔ آپ کی سیرت کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے پرامن جدوجہد کے تمام اصول کامیابی کے ساتھ مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نمایاں اصول یہ ہیں۔

۱۔ تحریک کا آغاز دعوت سے کرنا نہ کہ عملی اقدام سے (ابتدائی دور رسالت)

۲۔ فیصلہ کن مرحلہ میں پہنچنے سے پہلے عملی برائیوں کو برداشت کرنا (کعبہ میں بت)

۳۔ فریق ثانی کی زیادتی کے باوجود یک طرفہ صبر کرنا (مکی دور)

۴۔ جنگی ٹکراؤ کو آخری حد تک اوائڈ کرنا (غزوۂ خندق)

۵۔ مقام نزاع سے اپنے آپ کو دور رکھنا۔ (ہجرت)

۶۔ صرف دفاع میں لڑنا، وہ بھی اس وقت جب کہ کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے (احد و حنین)

۷۔ اقدام میں خاموشی کا طریقہ اختیار کرنا (مکہ کی طرف مارچ)

۸۔ جنگ چھڑ جائے تو ہر قیمت پر اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنا (صلح حدیبیہ)

۹۔ قابو پانے کے باوجود دشمن کو معاف کر کے اس کو اپنا ساتھی بنالینا (فتح مکہ)

۱۰۔ مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے مواقع کو استعمال کرنے کی پالیسی اختیار کرنا

پیغمبر اسلام ﷺ صرف ۲۳ سال کی مدت میں پورے عرب میں ایک زبردست انقلاب

لے آئے۔ اس جدو جہد کے دوران فریق مخالف نے ۸۰ سے زیادہ بار آپ کو جنگ میں الجھانا چاہا مگر آپ کی پر امن پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عملاً صرف تین بار (بدر، احد، حنین) صرف آدھے آدھے دن کے لئے با قاعدہ جنگ پیش آئی، وہ بھی ناگزیر دفاع کے طور پر۔ اس پوری مدت میں دونوں جانب کے ڈیڑھ سو سے بھی کم آدمی مارے گئے۔ یہ پورے معنوں میں ایک غیر خونی انقلاب (bloodless revolution) تھا۔

اس انقلاب کے نتیجہ میں ایک عمل (process) جاری ہوا جو تاریخ میں مسلسل سفر کرتا رہا۔ اسلام کی پیدا کردہ دوسری تبدیلیوں کی طرح اسلام کا یہ پر امن انقلاب بھی پراسس کے روپ میں تاریخ میں جاری رہا۔ موجودہ زمانہ میں اسی تصور نے پیسیفزم (peacifism) کے نام سے ایک مستقل سماجی نظریہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اس میں کانٹ، سیموئیل، کالون سے لے کر مہاتما گاندھی تک بہت سی شخصیتوں کے نام شامل ہیں۔

مگر جہاں تک اس کی عملی کامیابی کا تعلق ہے، اس کی کوئی بھی دوسری نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر ہندستان کا گاندھیائی انقلاب (۱۹۴۷) عدم تشدد (non-violence) کے ذریعہ وجود میں آیا۔ مگر اس انقلاب نے ہندستانی سماج کے اندر عمومی معنوں میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں پیدا کی۔ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ کہ انگریزی افراد کے بجائے کچھ ہندستانی افراد حکومت پر قابض ہوگئے۔ اسی طرح ساؤتھ افریقہ کا حالیہ انقلاب بھی سماجی معنوں میں وہاں کوئی صالح تبدیلی پیدا نہ کرسکا۔ اس کے نتیجہ میں دوبارہ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ ملک میں سفید فام افراد کے بجائے کچھ سیاہ فام افراد اقتدار کے منصب پر قابض ہوگئے، وغیرہ۔

جمہوری دور کا آغاز

اسلام سے پہلے ساری دنیا میں بادشاہت کا رواج تھا۔ یہ سیاسی رواج ہزاروں سال سے چلا آرہا تھا۔ اس نظام کے تحت صرف شاہی خاندان سارے اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔ عوام کی حیثیت صرف رعایا کی تھی نہ کہ حقیقی معنوں میں آزاد شہری کی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ سیاسی

تاریخ کا کوئی بھی طالب علم اس سے ناواقف نہیں۔

اسلام نے پہلی بار قومی زندگی میں جمہوریت کا آغاز کیا جس کو قرآنی زبان میں شورائیت کہا جاتا ہے۔ یہ جمہوری تعلیم قرآن میں ان الفاظ میں دی گئی ہے: امرھم شوریٰ بینھم (الشوریٰ ۳۸) یعنی ان کے اجتماعی اور سیاسی معاملات کا فیصلہ باہمی مشورہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

قدیم انسانی تاریخ میں اسلام نے پہلی بار یہ سیاسی روایت قائم کی کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات کے بعد خلیفہ کا تقرر نسلی بنیاد پر نہیں کیا گیا بلکہ عوام کی رائے سے کیا گیا۔ اسلام کے دور اول میں چاروں معیاری خلفاء اسی طرح جمہوری انداز میں منتخب کئے گئے۔ اس طرح اسلام نے تاریخ میں پہلی بار نسلی بادشاہت کے بجائے عوامی جمہوریت کا اصول سیاست کی دنیا میں قائم کیا۔

بعد کی تاریخ میں اگرچہ یہ جمہوری اصول اپنی معیاری صورت میں رائج نہ رہ سکا، تاہم اسلامی انقلاب کے اثر سے یہ فضا ہمیشہ قائم رہی کہ کسی سلطان کے لئے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ قدیم طرز کا مطلق العنان بادشاہ بن جائے۔ بنو امیہ کے دور میں سلیمان بن عبد الملک نے اپنے ذاتی فیصلہ کے تحت شاہی خاندان کے ایک فرد عمر بن عبد العزیز کو خلیفہ نامزد کیا۔ جب عمر بن عبد العزیز کو تقرر نامہ ملا تو انھوں نے دمشق کی وسیع مسجد میں لوگوں کو جمع کیا اور یہ اعلان کیا کہ اس شاہی تقرر نامہ کو میں تمہاری طرف واپس کرتا ہوں۔ اب تم لوگوں کو اختیار ہے تم جس کو چاہو اس کو اپنی آزاد رائے سے اپنا خلیفہ منتخب کرلو۔ لوگوں نے بالاتفاق رائے کہا کہ ہم آپ ہی کو خلیفہ کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ اس کے بعد عمر بن عبد العزیز نے خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالا۔

اس طرح کی انقلابی تبدیلی انسانی سماج میں فوری طور پر نہیں آتی۔ اس کے مکمل ظہور کے لئے لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ یہی اس معاملہ میں بھی پیش آیا۔ اسلام کا پیدا کردہ جمہوری انقلاب تاریخ میں ایک عمل (process) کے روپ میں جاری ہو گیا۔ وہ ملک در ملک مسلسل سفر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی میں یورپ میں داخل ہو کر وہ فرانس کے جمہوری

انقلاب کی صورت میں اپنی تکمیل کے مرحلہ تک پہنچا۔ موجودہ جمہوریت ، جس کو مغربی جمہوریت کہا جاتا ہے، وہ دراصل اسلام کے اسی شورائی نظام کا ایک سیکولر ایڈیشن ہے۔

انقلاب کا نمونہ قائم کرنا

انقلاب (revolution) کا لفظ اہل فکر کے لئے ایک بے حد پسندیدہ مقصود (cherished goal) رہا ہے۔ مگر معلوم تاریخ میں یہ مقصد پورے معنوں میں صرف ایک بار حاصل کیا جاسکا۔ یہ پیغمبر اسلام ﷺ کا لایا ہوا انقلاب تھا جو ساتویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے واقعات کو انقلاب (ریولیوشن) کہا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام واقعات اپنی حقیقت کے اعتبار سے کو (coup) تھے نہ کہ کوئی ریولیوشن۔ ان تمام واقعات میں جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ لمبے خونی مرحلہ کے بعد ایک حکمراں گروہ ہٹادیا گیا اور دوسرے حکمراں گروہ کو اس کی جگہ پر بٹھادیا گیا۔ جب کہ ریولیوشن ایک ایسے عمومی واقعہ کا نام ہے جس میں اخلاقی ، معاشی، سماجی ، غرض، زندگی کے ہر دائرہ میں نئی صالح تبدیلی وقوع میں آجائے۔ اور ایسا پوری انسانی تاریخ میں صرف ایک بار اسلامی انقلاب کی صورت میں پیش آیا۔

انقلابی تحریکوں کی لمبی ناکام تاریخ میں اسلام کا یہ تجربہ روشنی کے ایک بلند مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی انقلاب کی تکمیل کے بعد پہلی بار ایک ایسا سماج وجود میں آیا جو ایسے افراد پر مشتمل تھا جن کے کیریکٹر پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ جس میں معاشی استحصال کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ جہاں ہر انسان ہر قسم کے فرق کے باوجود برابری کے ماحول میں رہ سکتا تھا۔ جس میں انسانی تعلقات کی بنیاد استحصال (exploitation) کے بجائے برادرانہ تعاون پر قائم کی گئی تھی۔ جہاں سیاسی حکمراں عام انسانوں کی طرح رہتے تھے نہ کہ لوگوں کے آقا کی طرح، جہاں ہر ایک کو یقین تھا کہ وہ عدالت سے انصاف حاصل کر سکتا ہے۔

اس کامیاب عملی مثال کے ذریعہ اسلام ساری انسانیت کو ایک ایسا حقیقی نمونہ دے رہا ہے جس کی پیروی کر کے وہ بہتر دنیا کے بارے میں اپنے خواب کی تکمیل کر سکے۔ اسلامی انقلاب ایک

اعتبار سے ماضی کی تاریخ کا ایک واقعہ ہے، اور دوسرے اعتبار سے حال اور مستقبل کی تعمیر کا ایک پروگرام۔

اسلام کا رول انسانی تاریخ میں صرف یہ نہیں ہے کہ اس نے زندگی کے لئے ایک صحیح اور قابل اعتماد آئیڈیالوجی انسان کو دی۔ اسی کے ساتھ انسانیت کے لئے اسلام کا ایک عطیہ یہ بھی ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لئے ایک عملی نمونہ قائم کیا۔ اس طرح اسلام کے ذریعہ انسانوں کو یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ اعلیٰ انسانی آئیڈیل ایک خیالی آئیڈیل نہیں۔ وہ ایک ایسا آئیڈیل ہے جو پوری طرح قابل عمل ہے۔ اور ہماری معلوم تاریخ کے اندر وہ عملی طور پر پوری طرح قائم بھی ہو چکا ہے۔ اسلام نظری سچائی بھی ہے، اور اسی کے ساتھ ایک قائم شدہ عملی نظام بھی۔

نمونۂ انسانیت

سوامی ویویکانند (۱۹۰۲ - ۱۸۶۳) نے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا کہ میرا تجربہ ہے کہ اگر کبھی کوئی مذہب انسانی برابری کی منزل تک قابل لحاظ حد تک پہونچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس لیے میرا یہ قطعی خیال ہے کہ عمل اسلام کی مدد کے بغیر، ویدانتزم کے نظریات، خواہ وہ کتنے ہی اچھے اور شاندار ہوں، عام انسان کے لیے بالکل بے فائدہ ہیں۔ ہمارے مادر وطن کے لیے دو عظیم نظاموں کا ملاپ، ہندوازم اور اسلام ―― ویدانت دماغ اور اسلام جسم ―― واحد امید ہے۔ میں اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندستان، انتشار اور افتراق سے نکل کر ویدانت دماغ اور اسلام جسم کے ذریعہ کامیاب اور فتح مند ہو رہا ہے:

My experience is that if ever any religion approached to this equality in an appreciable manner, it is Islam and Islam alone. Therefore I am firmly persuaded that without the help of practical Islam, theories of Vedantism, however fine and wonderful they may be, are entirely valueless to the vast mass of mankind. For our own motherland, a junction of the two great systems, Hinduism and Islam—Vedanta brain and Islam body—is the only hope. I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this chaos and strife, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body.

Letters of Swami Vivekananda (1986), pp.379-80.

مہاتما گاندھی (۱۹۴۸ - ۱۸۶۹) کانگریسی لیڈروں کو یہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ وہ خلیفہ ابوبکر اور خلیفہ عمر کی پیروی کریں:

We have to follow the example of Abu Bakr and Umar.

گاندھی جی نے ایک بار اپنے اخبار (ہریجن) میں لکھا تھا کہ سادگی کانگریسیوں ہی کا اجارہ نہیں۔ میں رام چندر اور کرشن کا حوالہ نہیں دیتا۔ کیوں کہ وہ تاریخی شخصیتیں نہ تھیں۔ میں مجبور ہوں کہ ابوبکر اور عمر کے نام کا حوالہ دوں۔ اگرچہ وہ بہت بڑی سلطنت کے حاکم تھے۔ مگر انھوں نے فقیروں جیسی زندگی گزاری:

Simplicity is not the monopoly of Congressites. I am not going to mention the names of Rama and Krishna because they were not historic personalities. I am compelled to mention the names of Abu Bakr and Umar. Though they were masters of vast empire, yet they lived the life of paupers.
Harijan, July 27, 1937.

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی شخصیتوں نے اسلام کی صورت میں جو تاریخ بنائی ہے، وہ ساری انسانیت کے لیے نمونہ کی تاریخ ہے۔ اسلام نے اُن اوصاف کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کی ہیں۔ جن کو انسانی اوصاف کہا جاتا ہے۔ فرضی قصے کہانیوں کی صورت میں کوئی بھی شخص ایک کتاب لکھ سکتا ہے۔ مگر انسانیت کے نمونہ کے لیے حقیقی کردار کا حوالہ دینا ہو تو اسلامی شخصیتوں کے سوا کسی اور کا حوالہ نہیں دیا جاسکتا۔ اس اعتبار سے یہ اسلامی شخصیتیں ساری انسانیت کا مشترک اخلاقی ورثہ ہیں۔ وہ تمام انسانوں کے لیے بہترین اخلاقی نمونہ ہیں یہاں ہم اس بات کی وضاحت کے لیے مختلف پہلوؤں سے چند تاریخی مثالیں نقل کریں گے۔

اعتماد و توکل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تبلیغ کے تقریباً بارہ سال اسی شہر میں گزارے۔ اس زمانہ میں مکہ پر مشرکوں کا غلبہ تھا۔ انھوں نے آپ کو سخت تکلیفیں پہونچائیں۔ یہاں تک کہ آپ کو مار ڈالنے کے درپے ہوگیے۔ جب یہ نوبت آگئی تو آپ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گیے۔

اس وقت حالات اتنے سخت تھے کہ مکہ سے نکل کر سیدھے مدینہ جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے آپ جب مکہ چھوڑ کر نکلے تو ابتداءً تین دن تک غار ثور میں مقیم رہے جو ایک دشوار گزار پہاڑ کے اوپر ایک تنگ مقام پر واقع تھا۔ تاہم آپ کے دشمن آپ کو تلاش کرتے ہوئے وہاں بھی پہونچ گیے۔ آپ اپنے رفیق حضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ غار میں تھے اور آپ کے دشمن تلواریں لیے ہوئے غار سے اتنے قریب کھڑے ہوئے تھے کہ آپ ان کے قدموں کو دیکھ سکتے تھے۔ تمام ظاہری قرائن کے مطابق ہلاکت آپ کے بالکل قریب پہونچ چکی تھی۔ حضرت ابو بکر صدیق کو یہ صورت حال دیکھ کر سخت تشویش ہوئی۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وہ تو یہاں بھی آگیے۔ آپ نے نہایت سکون کے ساتھ جواب دیا:
یا ابا بکر ماظنك باثنین اللّٰہ ثالثھما (اے ابو بکر تمہارا ان دو کے بارے میں کیا گمان ہے

جن کا تیسرا اللہ ہو)

یہ فقرہ بلاشبہ توکل واعتماد کا انتہائی کامل نمونہ ہے۔ اس واقعہ میں انسان توکل کے اس آخری مقام پر نظر آتا ہے جس کے آگے اس اعلیٰ انسانی صفت کا کوئی درجہ نہیں۔

ناخوشگواریوں پر صبر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ ہے۔ ایک قحط زدہ علاقہ کی مدد کے لیے آپ نے ایک یہودی تاجر سے کچھ دینار قرض لیے۔ اس یہودی کا نام زید بن سعنہ تھا۔ زید بن سعنہ سے یہ طے ہوا کہ آپ فلاں مقررہ مدت پر ۸۰ مثقال کھجوریں ادا کریں گے۔

کھجوروں کی ادائیگی کے وقت میں ابھی دو تین دن باقی تھے۔ کہ زید بن سعنہ اچانک آئے۔ اور ترش روئی کے ساتھ اپنے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ اس وقت آپ کے کندھے پر ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔ زید بن سعنہ نے چادر کو پکڑ کر زور سے کھینچا اور کہا کہ اے محمد میرا قرض کیوں نہیں ادا کرتے خدا کی قسم، میں اولاد مطلب کو جانتا ہوں۔ وہ سب کے سب نادہند ہیں۔

اس وقت حضرت عمر بن الخطاب آپ کے پاس موجود تھے۔ وہ غصہ ہو گیے اور بگڑ کر کہا کہ اے خدا کے دشمن تو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا تو اس سے نہیں ڈرتا کہ تیری گردن ماردی جائے۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ذرا بھی غصہ نہیں ہوئے۔ حتیٰ کہ یہ بھی نہیں کہا کہ تم وقت سے پہلے کیوں قرض کا تقاضا کر رہے ہو۔ اس کے بجائے آپ نے حضرت عمر کو تنبیہ کی اور کہا کہ اے عمر، میں اور یہ ایک اور چیز کے زیادہ محتاج تھے، وہ یہ کہ تم مجھ کو حق کی بہتر ادائیگی کے لیے کہتے اور اس کو حق کے بہتر مطالبہ کے لیے۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ زید بن سعنہ کو مقررہ مقدار میں کھجوریں ادا کر دی جائیں۔ نیز عمر کی سخت کلامی کے بدلے میں ۲۰ صاع کھجور اور زیادہ دی جائے۔ زید بن سعنہ آپ کے اس سلوک کو دیکھ کر اسلام میں داخل ہو گیے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت عرب کے حکمراں تھے۔ وہ زید بن سعنہ کے خلاف کوئی بھی سخت کارروائی کرنے کا پورا اختیار رکھتے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے زید بن سعنہ کی گستاخی اور بدسلوکی کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا۔ آپ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہوئے۔ یہ ایک انتہائی کامل اور تاریخی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ اعلیٰ انسانی سلوک کیا ہے۔ اور

کس طرح ایسا ہو سکتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں ایک شخص صبر و برداشت کے اصول پر قائم رہ کر زندگی گزار سکے۔

اعزاز کے بجائے ذمہ داری

ابوبکر بن ابی قحافہ اسلام کے پہلے خلیفہ ہیں۔ ان کا زمانہ خلافت ۶۳۲ سے ۶۳۴ تک ہے۔ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد جب ان کو خلیفہ منتخب کیا گیا تو اس کو انھوں نے عہدہ نہیں سمجھا، بلکہ اس کو ایک ذمہ داری سمجھا۔ وہ خوش ہونے کے بجائے فکرمند ہو گیے۔ بیعت کے بعد جب وہ لوگوں کو خطاب کرنے کے لیے ممبر پر کھڑے ہوئے تو احساس ذمہ داری کے تحت ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ انھوں نے کہا:

ایھا الناس قد وُلّیت علیکم ولستُ بخیرکم۔ فان احسنتُ فاعینونی وان اسأتُ فقوّمونی۔ الصدق امانة والکذب خیانة۔ والضعیف فیکم قوی عندی حتی آخذ له حقه۔ والقوی ضعیف عندی حتی آخذ منه الحق ان شاء الله تعالیٰ۔ (الکامل لابن الاثیر)

اے لوگو، میں تمہارے اوپر حاکم بنایا گیا ہوں، حالاں کہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کروں تو تم میری مدد کرو اور اگر میں برا کروں تو تم مجھ کو سیدھا کر دو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ اور تمہارا کمزور میرے نزدیک طاقتور ہے جب تک میں اس کا حق اس کو نہ دلا دوں۔ اور تمہارا طاقت ور میرے نزدیک کمزور ہے جب تک میں اس سے حق وصول نہ کر لوں، اگر اللہ نے چاہا۔

ابن سعد نے عطاء بن السائب سے نقل کیا ہے کہ جب ابوبکرؓ کی بیعت ہوئی تو اگلے دن لوگوں نے دیکھا کہ وہ حسب معمول اپنے کندھے پر کپڑا رکھے ہوئے بازار جا رہے ہیں۔ عمر فاروق نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بازار جا رہا ہوں۔ عمر فاروق نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اب آپ مسلمانوں کے حاکم ہیں۔ انھوں نے کہا میں اپنے اہل وعیال کو کہاں سے کھلاؤں گا۔ عمر فاروق نے کہا کہ ابوعبیدہ کے یہاں چلیے، وہ آپ کا کفاف مقرر کر دیں گے۔ چنانچہ دونوں ابوعبیدہ کے یہاں گیے۔ انھوں نے ایک عام آدمی کے معیار کے مطابق ابوبکر صدیق کا روزینہ مقرر کر دیا۔ اس میں دو جوڑا کپڑا بھی شامل تھا،

ایک جوڑا گرمی کے لیے، اور ایک جوڑا سردی کے موسم کے لیے۔ جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو آپ کے گھر میں نہ درہم تھا اور نہ دینار۔ صرف ایک زمین تھی۔ آپ نے وصیت کی کہ یہ زمین بیچ دی جائے اور اس کی قیمت سے وہ سب کچھ بیت المال میں واپس کر دیا جائے جو میں نے خلیفہ کی حیثیت سے لیا ہے۔

حکومتی عہدہ کو اعزاز سمجھنے کے بجائے ذمہ داری سمجھنے کی یہی مثال دوسرے خلفاء نے بھی قائم کی۔ یہ مثال تمام حکمرانوں کو بتاتی ہے کہ وہ کس طرح حکومت کو عزت و شہرت کی چیز نہ سمجھیں، بلکہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا ایک نازک منصب سمجھیں۔ یہی واحد چیز ہے جو کسی حکومت کو اس کے ماتحت عوام کے لیے خیر اور بھلائی کا ذریعہ بناتی ہے۔

معبود کی یکتائی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں مدینہ میں ہوئی۔ اس وقت لوگوں کے اوپر عجیب دیوانگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ بہت سے لوگوں کو یہ یقین ہی نہ آتا تھا کہ آپ کا انتقال ہو سکتا ہے یا انتقال ہو گیا ہے۔ حضرت عمر فاروق اس معاملہ میں سب سے آگے تھے۔ وہ مدینہ کی مسجد نبوی میں تلوار لے کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ جو شخص کہے گا کہ رسول اللہ کی وفات ہو گئی ہے میں اس تلوار سے اس کی گردن مار دوں گا۔

مسجد نبوی میں زبردست خلفشار جاری تھا۔ لوگ سخت مبہوت نظر آرہے تھے۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق وہاں آئے۔ انھوں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس کے بعد مسجد کے ایک طرف تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے یہ تاریخی جملہ کہا: من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن کان یعبد اللّٰہ فان اللّٰہ حي لایموت (جو شخص محمد کی عبادت کرتا تھا تو محمد کا انتقال ہو گیا اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے۔ اس پر کبھی موت آنے والی نہیں)

اس واقعہ میں انسان معرفت الٰہی کے آخری درجہ پر نظر آتا ہے۔ انسان انسان ہے اور خدا خدا ہے۔ اس حقیقت کو جاننا ہی اصل علم ہے۔ اور یہ واقعہ اس اصل علم کی آخری شاندار مثال ہے۔

حق کے آگے ڈھ پڑنا

اوپر جو واقعہ نقل کیا گیا اس موقع پر حضرت عمر فاروق کا کردار ابتداءً بے حد انتہا پسندانہ

تھا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ پیغمبر اسلام کا جسم بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔ مگر انھیں یقین نہیں آیا کہ یہ آپ کی وفات کا واقعہ ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ ایک قسم کی روحانی معراج کا واقعہ ہے آپ اپنے رب کے پاس گیے ہیں اور جلد ہی دوبارہ زمین پر واپس آئیں گے۔

وہ اس معاملہ میں کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے حتی کہ حضرت ابوبکر صدیق کی بھی نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے مسجد نبوی میں داخل ہوکر ان کو چپ ہونے کے لیے کہا۔ مگر وہ چپ ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ان کا ہاتھ تلوار کے دستہ پر تھا اور ان کی زبان بے تکان بولے چلی جارہی تھی۔ یہ لمحہ تھا جب کہ حضرت ابوبکر صدیق مسجد نبوی میں تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے حضرت عمر فاروق کی آواز پر اپنی آواز کو تیز کرتے ہوئے اپنی تقریر شروع کر دی۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق تقریر کرتے ہوئے اس آیت تک پہونچے : وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افأ مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علیٰ عقبیہ فلن یضرّ اللّٰہ شیئاً وسیجزی اللّٰہ الشاکرین۔ (محمد تو صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر وہ مرجائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو شخص الٹے پاؤں پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو ضرور بدلہ دے گا۔

قرآن کی اس آیت کا سننا تھا کہ فوراً حضرت عمر فاروق ٹھنڈے ہوگیے۔ بعد کے زمانہ میں انھوں نے اپنا اس وقت کا حال بتاتے ہوئے کہا : وقعتُ علی الارض وما تحملنی رجلای (میں زمین پر گر پڑا، میرے پاؤں میرا بوجھ نہ سنبھال سکے)

اس واقعہ میں انسان عبدیت کے آخری مقام پر نظر آتا ہے۔ عبدیت یہ ہے کہ انسان خدا کے آگے ڈھ پڑے۔ حضرت عمر فاروق یہی انسان ثابت ہوئے۔ وہ خدا کا کلام سن کر بالکل لفظی طور پر زمین پر گر پڑے۔ اپنی رائے کو انھوں نے اپنے دماغ سے اس طرح نکال دیا جیسے کہ وہ ان کے دماغ میں کبھی تھی ہی نہیں۔ یہ اعتراف حق کی بلند ترین مثال ہے۔ یہ مثال بتاتی ہے کہ حق کے ظاہر ہوجانے کے بعد کس طرح آدمی کو اس کے آگے جھک جانا چاہیے۔

سادہ زندگی

اسلامی خلفار کے زمانہ میں دولت اور اقتدار دونوں چیزوں میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا،

اس کے باوجود خلفار بالکل سادہ زندگی گزارتے تھے۔ اس کا اعتراف تمام مورخین نے کیا ہے۔ مانٹگومری واٹ (W. Montgomery Watt) نے لکھا ہے کہ مسلم خلفار جو اب ایک وسیع بادشاہت کے حکمراں تھے، وہ اب بھی مدینہ میں بے حد سادہ طریقہ سے رہتے تھے:

The ruler of what was now a vast empire still lived a very simple life in Medina, and had not so much as a bodyguard.
The Majesty That Was Islam, (1984)

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ کے حکمراں تھے، مگر جسم پر معمولی کپڑا ہوتا تھا، جس میں اکثر پیوند لگا رہتا تھا۔ پانی کی مشک کندھے پر رکھ کر چلتے تھے۔ پتھر کا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر زمین پر سو جاتے تھے۔ معمولی کھانا کھاتے اور معمولی گھر میں رہتے۔

ایک بار احنف بن قیس ان سے ملنے کے لیے مدینہ آئے تو دیکھا کہ معمولی حالت میں اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ احنف نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ حضرت عمر نے جواب دیا کہ بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے، اس کو تلاش کر رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ آپ امیر المومنین ہیں۔ آپ خود کیوں یہ زحمت اٹھا رہے ہیں۔ آپ نے کسی غلام کو حکم دے دیا ہوتا، وہ اس کام کو کر ڈالتا۔ حضرت عمر نے جواب دیا:

اىُّ عَبدٍ اعبدُ مِنّى   کون ہے جو مجھ سے بڑھ کر غلام ہو۔

سلطنت کا حاکم ہونے کے باوجود اپنے کو عام آدمیوں سے ایک آدمی سمجھنا، اعلیٰ ترین حاکمانہ اخلاق ہے، مگر اس حاکمانہ اخلاق کی عملی مثال اسلامی تاریخ کے سوا کہیں اور نہیں ملے گی۔

حضرت عمر فاروق کا زمانۂ خلافت ۶۳۴ء سے ۶۴۴ء تک ہے۔ انھیں کے زمانہ میں فلسطین فتح ہوا۔ اس فتح کے موقع پر فلسطین کے مسیحی ذمہ داروں کی طلب پر، حضرت عمر نے مدینہ سے فلسطین کا سفر کیا۔ یہ سفر ایک عظیم سلطنت کے عظیم حکمراں کا تھا۔ مگر وہ اتنا سادہ تھا کہ اس کے آگے سادگی کا مزید تصور نہیں کیا جا سکتا۔

عبد اللہ التل جو فلسطین کی جنگ (۱۹۴۸) میں شریک تھے۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے خطر الیھودیۃ العالمیۃ علی الاسلام والمسیحیۃ۔ یہ کتاب دار القلم

(قاہرہ) سے ۱۹۶۴ میں شائع ہوئی ہے۔ عبداللہ التل کو فلسطین کے ایک معبد میں ایک تاریخی مخطوطہ یونانی زبان میں لکھا ہوا ملا۔ یہ مخطوطہ جو قدیم زمانہ میں کسی عیسائی نے لکھا تھا، اس میں حضرت عمر کے داخلۂ فلسطین کا تذکرہ ہے۔ عبداللہ التل نے اس مخطوطہ کا عربی ترجمہ اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

جب بیت المقدس پر مسلم فوجوں کا حصار بڑھا تو ۶۳۶ء میں وہاں کا بڑا پادری صفرونیوس شہر کی دیوار پر چڑھا۔ اس نے مسلم فوج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہم تم سے صلح کرنا چاہتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ صلح تمہارے امیر کے ہاتھ پر ہوگی۔ چنانچہ اس مضمون کا ایک خط مدینہ بھیجا گیا تاکہ امیر المومنین فلسطین آئیں اور اہل فلسطین سے صلح کا معاملہ طے کریں۔

عمر فاروق مدینہ سے بیت المقدس جانے کے لیے نکلے۔ مگر حال یہ تھا کہ ان کے ساتھ صرف ایک سواری اور ایک غلام تھا۔ جب وہ شہر سے باہر آئے تو اپنے غلام سے کہا کہ ہم دو ہیں اور سواری ایک ہے۔ اگر میں سواری پر بیٹھوں اور تم پیدل چلو تو میں تمہارے اوپر ظلم کروں گا۔ اور اگر تم سواری پر بیٹھو اور میں پیدل چلوں تو تم میرے اوپر ظلم کروگے۔ اور اگر ہم دونوں سواری پر بیٹھ جائیں تو ہم اس کی پیٹھ توڑ ڈالیں گے۔ اس لیے ہم لوگ تین باری مقرر کرلیں۔ چنانچہ انھوں نے راستہ اس طرح طے کیا کہ ایک بار عمر سواری پر بیٹھتے اور غلام پیدل چلتا۔ اس کے بعد غلام سواری پر بیٹھتا اور عمر پیدل چلتے۔ اور پھر دونوں پیدل چلتے اور سواری خالی رہتی۔ اس طرح وہ سفر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ قدس کے قریب پہونچ گئے۔

اتفاق سے اس وقت غلام کی باری تھی۔ غلام نے سواری پر بیٹھ کر چلنے سے انکار کیا اور چاہا کہ آخری مرحلہ میں شہر میں داخلہ اس حال میں ہو کہ سواری پر عمر فاروق بیٹھے ہوئے ہوں۔ مگر عمر فاروق اس پر راضی نہیں ہوئے۔ اور وہ قدس کے دروازے پر اس حال میں پہونچے کہ غلام سواری پر تھا اور عمر فاروق پیدل چل رہے تھے، عمر فاروق کو اس حال میں دیکھ کر شہر کے پادریوں نے دروازہ کھول دیا اور عمر کے ہاتھ پر صلح کرلی۔

صلح نامہ کی تکمیل کے بعد حضرت عمر نے ایک مختصر تقریر کی جس میں کہا کہ اے اہل فلسطین، جو ہمارے لیے ہے وہ تمہارے لیے ہے اور جو ہمارے لیے نہیں وہ تمہارے لیے بھی نہیں۔ اے اہل

ایلیاء، لکم مالنا وعلیکم ماعلینا) عمر فاروق کا یہ سفر تمام دنیا کے حکمرانوں کے لیے بلاشبہ آخری اور کامل ترین نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

احترام انسانیت

خلیفہ ثانی عمر فاروقؓ کے زمانہ میں حضرت عمرو بن العاص مصر کے گورنر تھے۔ انھوں نے ایک بار گھوڑوں کی دوڑ کرائی۔ اس دوڑ میں گورنر کے بیٹے کا گھوڑا بھی شریک تھا۔ مگر جب دوڑ ہوئی تو ایک مصری (غیر مسلم) کا گھوڑا آگے بڑھ گیا۔ مصری نے فتح کے جوش میں کوئی ایسا جملہ کہا جو گورنر کے صاحبزادے (محمد بن عمرو بن العاص) کو برا معلوم ہوا اور انھوں نے مذکورہ مصری کو کوڑے سے مار دیا۔ مارتے ہوئے ان کی زبان سے نکلا: خذها وانا ابن الاکرمین (یہ لو، اور میں شریفوں کی اولاد ہوں)

حضرت انس بن مالک اس قصہ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مصری (غیر مسلم) مصر سے چل کر مدینہ پہونچا اور خلیفہ ثانی عمر فاروق سے شکایت کی کہ گورنر کے لڑکے نے اس طرح اس کو کوڑے سے مارا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرو۔ اور فوراً اپنے ایک خاص آدمی کو مصر بھیجا کہ عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے محمد بن عمرو جس حال میں ہوں اسی حال میں ان کو لے کر مدینہ آؤ۔ چنانچہ وہ لوگ لائے گیے۔ جب وہ مدینہ پہونچے تو حضرت عمر نے فرمایا: این المصری، دونک الدرۃ فاضرب بها ابن الاکرمین (مصری کہاں ہے۔ یہ کوڑا لو اور اس سے شریف زادہ کو مارو)

اس کے بعد مصری نے کوڑا لیا اور گورنر مصر کے سامنے ان کے صاحبزادہ کو مارنا شروع کیا۔ وہ مارتا رہا، یہاں تک کہ ان کو زخمی کر دیا۔ حضرت عمر درمیان میں کہتے جاتے تھے کہ شریف زادہ کو مارو جب وہ خوب مار چکا تو حضرت عمر فاروق نے کہا کہ ان کے والد عمرو بن العاص کے سر پر بھی مارو کیوں کہ خدا کی قسم ان کے بیٹے نے صرف اپنے باپ کی بڑائی کے زور پر تم کو مارا تھا۔ (فواللہ ماضربك ابنہ الا بفضل سلطانہ)

مصری نے کہا کہ اے امیر المومنین، جس نے مجھ کو مارا تھا اس کو میں نے مار لیا۔ اس سے زیادہ کی مجھے حاجت نہیں۔ حضرت عمر نے کہا: خدا کی قسم اگر تم ان کو بھی مارتے تو ہم تمہارے اور ان کے درمیان حائل نہ ہوتے، یہاں تک کہ تم خود ہی ان کو چھوڑ دو۔ پھر آپ نے عمرو بن العاص سے مخاطب ہو کر فرمایا: یا عمرو، متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا (اے عمرو، تم نے کب سے

لوگوں کو غلام بنا لیا، حالاں کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا) ابن جوزی، سیرۃ عمر بن الخطاب

یہ واقعہ انسانی احترام اور انسانی برابری کی آخری اعلیٰ مثال ہے۔ اس واقعہ نے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ہر قسم کے فرق کو عملاً ختم کر دیا۔ اس نے انسانی عدل و انصاف کی ایسی نظیر قائم کر دی جس کے آگے انسانی عدل و انصاف کا کوئی اور درجہ نہیں۔

بے غرضی

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں قحط پڑا اور لوگ سخت پریشان ہو گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ نہ گھبراؤ۔ اللہ جلد ہی تمھارے لئے کشادگی کی صورت پیدا کر دے گا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ شام سے آیا، اس میں ایک ہزار اونٹ تھے اور سب کے سب گیہوں اور کھانے کی چیزوں سے لدے ہوئے تھے۔ یہ خبر مدینہ میں پھیلی تو شہر کے تاجر عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے۔ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آئے۔ ان کے پاس ایک چادر تھی جس کو وہ اپنے کندھے پر اس طرح ڈالے ہوئے تھے کہ اس کا ایک سرا سامنے کی طرف لٹک رہا تھا اور دوسرا سرا پیچھے کی طرف۔

عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم لوگ کیوں آئے ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ تاجروں نے کہا: ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ آپ کے پاس ایک ہزار اونٹ گیہوں اور غذائی سامان آیا ہے۔ ہم ان کو خریدنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمارے ہاتھ یہ غذائی سامان بیچ دیں تاکہ ہم اس کو مدینہ کے ضرورت مندوں تک پہنچا سکیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اندر آؤ اور گھر میں بیٹھ کر بات کرو۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ غذائی اشیاء کے ایک ہزار ڈھیر گھر کے اندر پڑے ہوئے ہیں۔

اب بات چیت شروع ہوئی۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: میری شام کی خریداری پر تم مجھ کو کتنا زیادہ نفع دوگے۔ انھوں نے کہا: دس درہم پر بارہ درہم۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھ کو اس سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا: دس درہم پر چودہ درہم۔ حضرت عثمان نے کہا مجھ کو اس سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا اچھا دس درہم پر پندرہ درہم۔ حضرت عثمان نے کہا کہ مجھ کو اس سے بھی زیادہ مل رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کون آپ کو اس سے زیادہ دے رہا ہے۔ جب کہ مدینہ کے جتنے تاجر ہیں سب یہاں جمع ہیں۔ حضرت عثمان نے کہا کہ مجھ کو ہر ایک درہم کے بدلے دس درہم مل رہا ہے۔ پھر کیا تم اس سے زیادہ دے سکتے ہو۔ انھوں نے کہا نہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ اللہ نے اپنی کتاب پاک میں فرمایا ہے

کہ جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لئے اس کا دس گنا بدلہ ہے (انعام ۱۶۰) تو اے مدینہ کے تاجرو! گواہ رہو کہ میں نے یہ تمام غذائی سامان اللہ کے لئے شہر کے ضرورت مندوں پر صدقہ کر دیا (العبقریات الاسلامیہ، صفحہ ۵۷۲)

یہ واقعہ خدا کے وعدہ پر یقین کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ خدا پر ایمان آدمی کے اندر اسی قسم کا یقین واعتماد پیدا کرتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر اس قسم کا یقین واعتماد پیدا ہو جائے وہ اغراض ومصالح سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اس کے حوصلے اتنا زیادہ بلند ہو جاتے ہیں کہ اس کے بعد بڑی سے بڑی قربانی بھی اس کے لیے مشکل چیز نہیں رہتی۔

عوام اور حاکم کے درمیان قانونی برابری

حضرت علی بن ابی طالب اسلام کے چوتھے خلیفہ تھے۔ انھیں غیر معمولی اقتدار حاصل تھا، مگر وہ لوگوں کے درمیان ایک عام انسان کی طرح رہتے تھے۔ نہ ان کا معیار زندگی دوسروں سے مختلف تھا اور نہ ان کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قانونی حقوق حاصل تھے۔

ترمذی، حاکم اور ابونعیم نے حضرت علی بن ابی طالب کا ایک واقعہ اس طرح نقل کیا ہے۔ حضرت علی کے پاس ایک زرہ تھی جو اتفاق سے کھوئی گئی۔ ایک روز وہ کوفہ کے بازار کی طرف گیے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک نصرانی زرہ بیچ رہا ہے۔ قریب جاکر دیکھا تو یہ وہی زرہ تھی جو ان سے کھوئی گئی تھی۔

حضرت علی اس وقت ممالک اسلامی کے حکمراں تھے۔ وہ چاہتے تو اسی وقت زرہ پر قبضہ کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہ سمجھا۔ انھوں نے نصرانی سے کہا کہ یہ زرہ میری ہے۔ تم اس کو لے کر قاضی کے پاس چلو۔ وہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ اس وقت مسلمانوں کے قاضی شُریح تھے۔ چنانچہ دونوں بازار سے چل کر قاضی شُریح کے یہاں پہنچے۔

شریح نے بحیثیت قاضی کے پوچھا کہ امیر المومنین، آپ کیا کہتے ہیں۔ حضرت علی نے کہا کہ یہ زرہ میری ہے، وہ مجھے واپس دلائی جائے۔ شُریح نے نصرانی سے پوچھا کہ تم کیا کہتے ہو۔ اس نے کہا کہ

امیرالمومنین غلط بیانی کررہے ہیں، یہ زرہ میری ہے۔ قاضی شُریح نے حضرت علی سے کہا کہ محض آپ کے دعوے کی بنا پر میں ایسا نہیں کرسکتا کہ زرہ اس سے لے کر آپ کو دیدوں۔ آپ اپنے دعوے کے حق میں ثبوت لائیے۔

حضرت علی نے کہا کہ شُریح کا مطالبہ درست ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے حق میں دو گواہ پیش کیے۔ ایک، اپنے غلام قنبر کو، اور دوسرے، اپنے لڑکے حسن کو۔ قاضی شریح نے کہا کہ میں قنبر کی گواہی کو تو مان رہا ہوں، مگر میں حسن کی گواہی کو نہیں مانتا۔ حضرت علی نے کہا کہ تم حسن کی گواہی نہیں مانتے، حالاں کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسن اور حسین نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ قاضی شُریح نے کہا کہ وہ الگ چیز ہے۔ دنیوی معاملات میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ والد کے حق میں اولاد کی گواہی معتبر نہیں۔

حضرت علی خلیفہ تھے اور وہ قاضی کو معزول کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ مگر انھوں نے قاضی کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دیا۔ اور زرہ کے بارہ میں اپنا مطالبہ واپس لے لیا۔ نصرانی یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ چیخ اٹھا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ پیغمبروں کے احکام ہیں کہ امیرالمومنین ایک عام آدمی کی طرح قاضی کی عدالت میں آئے اور قاضی اس کے خلاف فیصلہ کرے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ یہ زرہ واقعۃً علی کی ہے۔ ایک بار وہ علی کے اونٹ سے گر گئی تھی تو میں نے اس کو اٹھا لیا۔ اب حضرت علی نے وہ زرہ اسی شخص کو دے دی اور اس کو مزید سات سو درہم عطا کیے۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو کر حضرت علی کے ساتھ رہا یہاں تک کہ صفین کے معرکہ میں شہید ہو گیا (حیات الصحابہ، الجزء الاول، صفحہ ۴۴۴-۴۴۵)

یہ واقعہ اس اصول کی اعلیٰ ترین مثال ہے کہ حکمران افراد اور عام انسان دونوں قانون کی نگاہ میں برابر ہیں۔ قانون کی عدالت میں دونوں کو یکساں حاضر ہونا چاہیے اور دونوں کے اوپر قانون کا فیصلہ یکساں طور پر نافذ ہونا چاہیے۔

حقیقت پسندی

حضرت حسن حضرت علی کی شہادت کے بعد خلیفہ مقرر ہوئے۔ وہ اسلامی تاریخ کے پانچویں خلیفہ تھے۔ انھیں تمام شرعی اور اخلاقی اصولوں کے مطابق خلافت پر قائم رہنے کا حق حاصل تھا۔ مگر

جب انھیں خلافت ملی تو صورت حال یہ تھی کہ حضرت امیر معاویہ جو اس وقت شام کے حاکم تھے، انھوں نے خلافت سے باقاعدہ بغاوت کردی۔ خونِ عثمان کا بدلہ لینے کے نام پر انھوں نے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ کرلیا۔

حضرت حسن بن علی نے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ چالیس ہزار کی فوج ان کے ساتھ ہے اسی طرح حضرت امیر معاویہ کے ساتھ بھی تقریباً اتنے ہی آدمی تھے۔ یہ دونوں فوجیں جوش وجذبہ سے بھری ہوئی تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف لڑنے کے لیے بے قرار تھیں۔ مگر حضرت حسن نے سوچا کہ یہ دونوں کے دونوں مسلمان ہیں۔ جنگ کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان آپس میں لڑیں۔ وہ قیمتی افراد جو اسلام کے جھنڈے کے نیچے اس لیے جمع ہوئے تھے کہ وہ دنیا سے شرک کا خاتمہ کریں وہ خود اپنے آپ کو اور اسی کے ساتھ اسلامی تاریخ کو ختم کرڈالیں گے۔

حضرت حسن کی حیثیت جائز خلیفۂ اسلام کی تھی۔ جب کہ امیر معاویہ کی حیثیت یقینی طور پر باغی کی تھی مگر حضرت حسن نے بجا طور پر یہ اندازہ لگایا کہ حضرت امیر معاویہ کسی قیمت پر جھکنے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ وہ ہر حال میں لڑائی کو جاری رکھیں گے خواہ اس کا نتیجہ مسلم سپاہیوں کی عام بربادی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حضرت حسن نے خود اپنے آپ کو جھکانے پر راضی کرلیا۔ مسلمانوں کو باہمی قتل وخون سے بچانے کے لیے انھوں نے یک طرفہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوجائیں۔

یہ حقیقت پسندی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ یہاں انسان حقیقت پسندی کی اعلیٰ ترین سطح پر نظر آتا ہے، وہ سطح جہاں انسان اپنے آپ کو حذف کرکے سوچ سکتا ہے۔ حضرت حسن نے اپنے آپ کو حذف کرکے سوچا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو راضی کرسکے جس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

عدل وانصاف

حضرت عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱-۶۲ ھ) پانچویں خلیفہ راشد ہیں۔ آپ کے خادم ابوامیہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز آپ کی اہلیہ سے کہا کہ مسور کی دال کھاتے کھاتے میرا برا حال ہوگیا ہے۔ خاتون نے جواب دیا: تمھارے خلیفہ کا بھی روز کا کھانا یہی ہے۔ آپ سے پہلے خلیفہ کی حفاظت کے لئے ایک سو سپاہی مقرر تھے، جب آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے سب کو دوسرے سرکاری کاموں میں لگادیا اور فرمایا: میری حفاظت کے لئے قضاء

قدر ہی کافی ہے۔ یہ اس شخص کا حال تھا جس کی سلطنت کے حدود سندھ سے لے کر فرانس تک پھیلے ہوئے تھے۔

آپ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ سمرقند کے باشندوں کا ایک وفد آیا۔ اس نے ایک فوجی سردار قتیبہ بن مسلم باہلی کے بارے میں یہ شکایت کی کہ اسلامی قاعدہ کے مطابق انھوں نے ہم کو پیشگی تنبیہ نہیں کی اور ہمارے شہر میں اچانک اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ لہٰذا ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔ سمرقند کی فتح حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے ہوئی تھی۔ اور اب اس پر سات سال گزر چکے تھے۔ مگر آپ نے انصاف کے تقاضے کو پورا کرنا ضروری سمجھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عراق کے حاکم کو لکھا کہ سمرقند کے لوگوں کے مقدمہ کی سماعت کے لئے ایک خصوصی قاضی مقرر کریں۔ عراق کے حاکم نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جمیع بن حاضر الباہلی کو اس کا قاضی مقرر کیا۔ ان کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ دونوں فریق نے آزادانہ طور پر اپنے اپنے دلائل پیش کئے۔ آخر میں قاضی نے سمرقند والوں کی شکایت کو درست قرار دیتے ہوئے فیصلہ سنایا کہ ——

مسلمانوں کی فوج سمرقند کو چھوڑ کر باہر آجائے اور اہلِ سمرقند کو ان کا قلعہ اور تمام دوسری چیزیں واپس کر دی جائیں۔ اس کے بعد اسلامی قاعدہ کے مطابق مسلمانوں کا فوجی سردار ان کے سامنے ضروری شرطیں پیش کرے۔ اگر وہ تمام شرطوں کو ماننے سے انکار کر دیں تو پھر اس کے بعد ان سے جنگ کی جائے۔

اسلامی فوج اس وقت فاتحانہ حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے چین جیسے ملک کے بادشاہوں کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر جب قاضی نے اپنا فیصلہ سنایا تو اسلامی فوج کے سردار نے کسی بحث کے بغیر اس کو مان لیا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ پوری فوج سمرقند چھوڑ کر نکل آئے۔ تاہم اس پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی۔ سمرقند کے لوگوں نے جب دیکھا کہ مسلمان اس قدر بااصول اور انصاف پسند ہیں تو وہ حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے انھوں نے کبھی ایسے بے لاگ انصاف کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلم فوج کا آنا ان کے لئے رحمت کا آنا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مرضی اور خوشی سے مسلم حکومت کو قبول کر لیا۔ وہ کہہ اٹھے: خوش آمدید، ہم آپ کے مطیع و فرماں بردار ہیں (مرحبا سمعنا واطعنا، فتوح البلدان للبلاذری)

یہ واقعہ عدل و انصاف کا جو نمونہ پیش کر رہا ہے۔ اس کی مثال ساری تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ اس واقعہ میں عدل و انصاف کا اصول اپنے آخری اعلیٰ مقام پر نظر آتا ہے۔ عدل بلاشبہ انسانی زندگی کی بلند ترین قدر ہے، اور یہ واقعہ اس قدر کے اعتراف کی بلند ترین عملی مثال۔

ہر دور میں تمام سوچنے والے انسانوں کا محبوب ترین مقصود یہ رہا ہے کہ وہ ایک ایسا انسانی نظام بنائیں جہاں حق کا غلبہ ہو، جہاں ہر ایک کو انصاف ملے۔ جہاں معاشی استحصال نہ ہو۔ جہاں ہر انسان کو عزت کی زندگی حاصل ہو۔ جہاں اعلیٰ انسانی قدروں کو فروغ ملے۔ اس قسم کا سماج بنانے کا دعویٰ تو بہت سے لوگوں نے کیا مگر عملی طور پر وہ اپنی کامل صورت میں صرف ایک بار قائم ہو سکا اور یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ کے زمانہ میں ہوا۔ اسلام کی پہلی جنریشن میں پیش آنے والا یہ واقعہ گویا تمام انسانیت کے لئے ایک نمونہ ہے۔ اب ہر دور کے انسانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ اس نمونہ کو دیکھیں اور اس نمونہ کی روشنی میں اپنی زندگی کا نظام بنائیں۔

اسلام تغیر پذیر دنیا میں

اسلام کا ظہور چودہ سو سال پہلے ہوا۔ پھر آج کی دنیا میں وہ کس طرح قابل عمل ہو سکتا ہے؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ پھر اسلام جیسا ایک غیر متغیر دین بعد کے زمانہ کے لوگوں کو کس طرح رہنمائی دے سکتا ہے۔ ایک نہ بدلتی ہوئی حقیقت بدلتے ہوئے حالات سے کس طرح ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔

یہ سوال تمام تر مفروضات پر قائم ہے۔ اس کے پیچھے غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسلام نہ کلی معنوں میں غیر متغیر حقیقت ہے اور نہ زمانہ کلی معنوں میں متغیر حقیقت۔ اصل یہ ہے کہ اسلام فطرت کا ایک قانون ہے۔ اسلام کا ایک حصہ وہ ہے جو اسی طرح ابدی ہے جس طرح فطری حقیقتیں ابدی ہوتی ہیں۔ اسلام کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں بدلتے ہوئے حالات کی رعایت پہلے ہی سے موجود ہے۔

خود زمانہ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ زمانی حالات کی نوعیت بھی یہی ہے کہ اس میں کچھ چیزیں ابدی طور پر یکساں رہتی ہیں۔ مثلاً سورج سے روشنی لینا اور ہوا سے آکسیجن حاصل کرنا۔ ان کے علاوہ کچھ چیزیں وہ ہیں جو ظاہری طور پر، نہ کہ حقیقی طور پر، بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً سواری یا طرز تعمیر وغیرہ۔ ان دوسرے قسم کے معاملات میں اسلام نے پیشگی طور پر ایسی رعایتیں اور گنجائشیں رکھ دی ہیں جو ہر بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہوں اور اس طرح اسلام ہمیشہ اپنی قابل عمل ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھے۔ یہاں اس مسئلہ کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ إن هذا الدين يسر (البخاری، کتاب الایمان) یعنی دین آسان ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دین میں سب آسانی اور سہولت والے احکام ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کا نظام ایسے فطری انداز میں بنایا گیا ہے کہ وہ ہر صورت حال میں قابل عمل رہے۔ اہل اسلام کا سفر حیات کبھی بھی کسی ایسے مرحلہ سے دوچار نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو بند گلی (impasse) میں محسوس کرنے لگیں۔

یہاں اس سلسلہ میں اسلام کے چند اصول درج کئے جاتے ہیں جن سے یہ بات بخوبی طور پر واضح ہوتی ہے کہ حالات کی کوئی بھی تبدیلی اسلام کے لئے مسئلہ نہیں۔ ہر صورت حال میں اسلام اپنی فعالیت کو یکساں

طور پر باقی رکھتا ہے۔

ا۔ اسلام کے کچھ احکام وہ ہیں جو بنیادی احکام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اسی طرح ابدی ہیں جس طرح فطرت کے قوانین ابدی ہیں۔ اسلام کے اسی حصہ کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ "لا مبدل لکلمات اللہ (الانعام ۳۴) یعنی اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ اسلام کا وہ حصہ ہے جس میں عقیدہ، اخلاقی اقدار اور بنیادی اصول حیات شامل ہیں۔ یہ تعلیمات سب کی سب ابدی ہیں۔ حالات میں کوئی بھی تبدیلی ان کی قدر و قیمت کو بدلنے والی نہیں۔ مثلاً خدا کو ایک جاننا یا سچ بولنا یا تمام انسانوں کو خون شریک بھائی (blood brothers) سمجھنا وغیرہ۔

تاہم یہاں بھی حالات کی ایک رعایت پیشگی طور پر رکھ دی گئی ہے اور وہ قانون اضطرار ہے۔ اس قانون کے مطابق انسان بس اتنے ہی کا مکلف ہے جتنا اس کے بس میں ہو (البقرہ ۲۸۶) مثلاً اگر حالات کا شدید تقاضا ہو تو اجازت ہے کہ آدمی توحید کو صرف دل سے مانے، وہ زبان سے اس کا اعلان واظہار نہ کرے۔ تکلیف بقدر وسع کا اصول ایک عام اصول ہے اور وہ عقیدہ سے لے کر عمل تک ہر چیز پر محیط ہے۔

۲۔ اس سلسلہ میں دوسرا اصول وہ ہے جو اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ انتم اعلم بأمر دنیا کم (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۵/۱۱۸) یعنی تم اپنے دنیا کے معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ یہ حدیث ابتدائی طور پر تأبیر نخل، بالفاظ دیگر، باغبانی (horticulture) کے بارے میں آئی ہے مگر توسیعی مفہوم کے اعتبار سے اس میں وہ تمام امور شامل ہو جاتے ہیں جن کا تعلق تعمیر دنیا سے ہے نہ کہ نجات آخرت سے۔ یہ اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم رہنما اصول ہے۔ اس نے نجات آخرت کے امور اور تعمیر دنیا کے امور کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ اس کے مطابق، اہل اسلام کو اخروی نجات والے معاملات میں قرآن وسنت سے ہدایت لینا ہے۔ اور جو امور معاملات دنیا کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں ان کے بارے میں اپنی تحقیق و ریسرچ کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہے۔ اس میں صنعت و زراعت کے تمام شعبے اور سائنس اور ٹکنالوجی کی تمام شاخیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح اہل اسلام کو یہ آزادی مل جاتی ہے کہ کسی اعتقادی بندش کے بغیر خالص علمی ریسرچ کی روشنی میں اپنے معاملات کا انتظام وانصرام کرتے رہیں۔

ان معاملات میں اسلام صرف وہاں دخل دے گا جہاں کوئی بات صراحۃً اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو۔ مثلاً ہوائی جہاز کی انڈسٹری کیسے قائم کی جائے اس میں اسلام کی طرف سے مکمل آزادی حاصل ہو گی۔ البتہ اگر یہ سوال ہو کہ ہوائی جہاز کے مسافروں کو سافٹ ڈرنک دیا جائے یا شراب تو یہاں اسلام یہ کہے گا کہ انہیں شراب کے بجائے سافٹ ڈرنک دینا چاہئے۔

۳۔ اس سلسلہ کی تیسری اہم تعلیم وہ ہے جو پیغمبر اسلام کے ایک اسوہ سے نکلتی ہے۔ مدنی دور میں ایک شخص (مسیلمہ) نے یہ اعلان کیا کہ میں بھی خدا کا پیغمبر ہوں اور مجھ کو محمد کے ساتھ پیغمبری میں شریک کیا گیا ہے (سیرت ابن ہشام ۴/ ۲۴۴)۔ اس مدعی نبوت کے دو سفیر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ اس معاملہ میں تمہاری رائے کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جو ہمارے صاحب کی رائے ہے وہی ہماری رائے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ دستور نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہ کیا جائے تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا (سیرۃ ابن کثیر ۴/ ۹۸) یہ کہہ کر آپ نے انہیں واپس بھیج دیا۔

اس سے ایک اہم اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملات جو اپنی نوعیت میں بین اقوامی (انٹر نیشنل) ہوں اور جن کے بارے میں واضح بین اقوامی روایات قائم ہو چکی ہوں ان میں اسلام کا بھی وہی اصول ہو گا جو مختلف قوموں کے درمیان عالمی سطح پر مان لیا گیا ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں عام طور پر جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج تھا چنانچہ اسلام میں بھی ایک مدت تک وہ اسی طرح رائج رہا مگر اب چونکہ اس معاملہ میں عالمی دستور بدل چکا ہے اس لئے اب اس پر عمل بھی نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ عراق-ایران جنگ ۸۸-۱۹۸۰ میں دونوں طرف ہزاروں کی تعداد میں جنگی قیدی پکڑے گئے۔ مگر ان میں سے کسی کو بھی غلام نہیں بنایا گیا۔ بلکہ ایک مدت تک قید میں رکھنے کے بعد تبادلہ کی بنیاد پر انہیں رہا کر دیا گیا۔

۴۔ کچھ امور وہ ہیں جن میں کچھ پہلو اتفاق کے ہوں، کچھ پہلو اختلاف کے۔ ایسے امور میں اسلام کا موقف بالکل واضح ہے۔ حالات کے مطابق، اس طرح کے معاملات میں بقدر ضرورت ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایسے مواقع پر آئیڈیل اپروچ کے بجائے پریکٹیکل اپروچ

اسلام کا طریقہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں سیکولرزم اور ڈیماکریسی اس کی واضح مثالیں ہیں۔ سیکولرزم کا مطلب ہے مذہب کو ذاتی دائرے میں رکھ کر بقیہ معاملات میں وہ طریقہ اختیار کرنا جس میں سماج کا مجموعی مفاد شامل ہو۔ مخصوص حالات میں اس کو اسلام میں بھی اختیار کیا جائے گا۔ اس کی ایک مثال خود پیغمبر کی زندگی میں مدنی دور کا ابتدائی نصف زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں مدینہ کی ابتدائی اسٹیٹ میں جو نظام اختیار کیا گیا وہ اپنے عملی ڈھانچہ کے اعتبار سے کم و بیش وہی تھا جس کو موجودہ زمانہ میں سیکولرزم کہا جاتا ہے۔

۵۔ ان سب کے باوجود ایسا ہو سکتا ہے کہ کچھ امور ایسے ہوں جن میں اسلام کا اور بدلی ہوئی دنیا کا اختلاف باقی رہے۔ ایسے معاملات کے لئے اسلام میں کیا ہدایت ہے اس کا جواب قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے کہ تم لوگوں کو نصیحت کرتے رہو، کیوں کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو، تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو (الغاشیہ)۔

اس سے یہ اصول ملتا ہے کہ اس قسم کے اختلافی امور میں دونوں فریقوں کے درمیان ڈائیلاگ ہوگا۔ اہل اسلام دوسروں کو اپنی پوزیشن بتانے کی کوشش کریں گے۔ خالص پرامن انداز میں یہ کوشش جاری رہے گی کہ حق واضح ہو، اور لوگ دلیل کی زبان سے مطمئن ہو کر حق کو قبول کرلیں۔

تاہم یہ سارا کام صرف پرامن ترغیب کے دائرہ میں ہوگا، کسی بھی حال میں کوئی متشددانہ طریقہ استعمال نہیں کیا جائے گا خواہ یہ اختلافات ختم ہو جائیں یا بدستور لمبی مدت تک باقی رہیں۔ یہ اصول اس بات کا ضامن ہے کہ اسلام کی پوزیشن فکری طور پر لوگوں کے اوپر واضح ہو جائے۔ اہل اسلام اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کو اس سے پوری طرح باخبر کردیں۔

اس کی ایک مثال مرد اور عورت کی صنفی مساوات (gender equality) کا مسئلہ ہے، اس معاملہ میں اسلام اور جدید مغرب کے نقطۂ نظر میں اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ جدید مغرب کا یہ کہنا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کا ورک پلیس (مقام کار) ایک ہے۔ مگر اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جہاں تک عزت، احترام اور انسانی حقوق کا سوال ہے، دونوں کے درمیان مکمل مساوات ضروری ہے۔ لیکن جہاں تک ورک پلیس کا تعلق ہے

دونوں کا ورک پلیس بنیادی طور پر الگ ہوگا۔ کیونکہ حیاتیات اور نفسیات کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ اس اختلاف کے سوال پر اسلام اور مغرب کے درمیان پچھلے سو سال سے رسمی اور غیر رسمی سطح پر ڈائیلاگ جاری ہے اگرچہ ابھی تک اس معاملہ میں دونوں کے درمیان کوئی اتفاق رائے ممکن نہ ہو سکا۔

اسلام کا رول

بہتر دنیا کی تعمیر میں اسلام کا ایک مستقل رول ہے۔ یہ رول اسلام کے ابتدائی زمانہ سے لے کر بعد کے زمانوں تک جاری رہا ہے اور مسلسل جاری رہیگا۔ یہاں مختصر طور پر اس کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو قدیم عرب میں قبائلی نظام تھا۔ ان کا کلچر انتقام کے اصول پر قائم تھا۔ ان کے یہاں جب اس قسم کا کوئی ایک واقعہ پیش آتا تو فریق ثانی کے لئے ضروری ہو جاتا کہ وہ اس کا انتقام لے۔ اس کے بعد انتقام کا انتقام لینے کی صورت میں یہ تباہ کن سلسلہ برابر جاری رہتا۔ یہ صورت حال قدیم عربوں کی ترقی میں مستقل رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ اسلام نے انتقام کلچر کی جگہ معافی کلچر کو رواج دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کے لئے ہر قسم کی ترقی کا دروازہ کھل گیا۔

۲۔ موجودہ زمانہ میں بھی اس قسم کی کئی چیزیں ہیں جہاں اسلام اپنا مثبت رول ادا کر سکتا ہے۔ مثلاً انفرادی آزادی بہت قیمتی چیز ہے مگر جدید مغربی تہذیب نے آزادی کو خیر مطلق (summum bonum) قرار دے کر اس کو لامحدود حد تک وسیع کر دیا۔ اس لامحدود آزادی کے بے شمار نقصانات ہیں جن کو آج دنیا مختلف صورتوں میں بھگت رہی ہے۔

تمام اہل دانش یہ مانتے ہیں کہ آزادی بلاشبہ ایک خیر ہے مگر لامحدود آزادی شر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جدید تہذیب یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ آزادی کو محدود کس طرح کیا جائے اور کس کے مقابلہ میں کیا جائے۔ یہاں اسلام یہ رہنمائی دیتا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی آزادی کو خدا کے مقابلہ میں محدود بنائے۔ انسان کے مقابلہ میں آزادی کو محدود کرنا بظاہر ناقابل فہم ہے مگر خدا کے مقابلہ میں آزادی کا تصور فوراً قابل فہم ہو جاتا ہے۔

اس نوعیت کی ایک کامیاب مثال اس سے پہلے سامنے آچکی ہے۔ پچھلے پانچ ہزار سال سے یورپ فلسفیوں کے اس تصور سے مسحور تھا کہ انسانی عقل حقیقت کلی تک پہنچ سکتی ہے۔ مگر اس رخ پر ہزاروں سال کی کوشش کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہنچی۔

اسلام نے اس معاملہ میں یہ رہنمائی دی کہ عقل انسانی صرف جزئی حقیقت کا احاطہ کر سکتی ہے، وہ کلی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی (وما اوتیتم من العلم الا قلیلا)۔ اس محدودیت کی بنا پر حقیقت کلی کو عقل کے ذریعہ دریافت کرنے کی کوشش ایک بے فائدہ کوشش ہے جو کبھی کسی واقعی نتیجہ تک پہنچنے والی نہیں۔

قرون وسطیٰ میں جب اسلامی فکر یورپ میں پھیلا تو اس نے تاریخ میں پہلی بار یہ ذہن بنایا کہ سائنسی ریسرچ کے دائرہ کو محدود رہنا چاہئے۔ اب یورپ کے اہل علم نے اشیاء کے معنوی پہلو کو اس کے مادی پہلو سے الگ کر دیا۔ وہ معنوی پہلو کو چھوڑ کر چیزوں کے مادی پہلو پر ریسرچ کرنے لگے۔ اس طرح اچانک سائنسی تحقیق بے فائدہ کوشش کے میدان سے نکل کر نتیجہ خیز عمل کے میدان میں داخل ہو گئی۔ "علم کثیر" کو چھوڑ کر "علم قلیل" پر راضی ہونے کا یہی اصول تھا جو جدید سائنسی تہذیب کو وجود میں لانے کا سبب بنا۔

اسی طرح جدید مغرب ایک اور سحر میں مبتلا ہے۔ یہ لا محدود آزادی کا سحر ہے۔ مگر دوبارہ فطرت کا قانون اس کے لئے ایک مستقل رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ لا محدود آزادی کے تصور کے تحت کبھی کوئی بہتر سماج نہیں بنایا جا سکتا۔ یہاں دوبارہ اسلام ایک عظیم رہنمائی دے رہا ہے۔ وہ یہ کہ انسان محدود آزادی پر راضی ہو جائے۔ کیونکہ موجودہ دنیا میں صرف یہی ممکن ہے۔

لا محدود آزادی کے تصور نے دنیا کو انارکی کا جنگل بنا دیا ہے۔ محدود آزادی کا اصول دنیا کو امن اور سکون کا سماج بنا سکتا ہے۔ یہ دوسرا اصول اسی طرح جدید دنیا میں ایک نیا انقلاب لا سکتا ہے جس طرح پہلا اصول قدیم دنیا میں ایک عظیم انقلاب لایا تھا۔

وہ چیز جس کو زمانہ کی تغیر پذیری کہا جاتا ہے، اس کے دو حصے ہیں۔ حقیقی تغیر اور اضافی تغیر۔ حقیقی تغیر یہ ہے کہ ماضی کے کسی غلط تصور کو غلط پا کر اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس قسم کا تغیر اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، اسلام کی طرف واپسی کے ہم معنی ہے۔ اور جہاں تک اضافی تغیر کا سوال ہے، وہ ہمیشہ وقتی ہوتا ہے۔ حالات کے بدلنے کے ساتھ وہ خود بدل جاتا ہے۔

پہلے قسم کے تغیر کی مثال وہ توہمات ہیں جو قدیم زمانہ میں انسانی سماج کے اندر رائج تھے۔ مثلاً بعض بیماریوں کو دیوتاؤں کے اثر کا نتیجہ سمجھنا۔ جدید دور نے اس عقیدہ کو باطل ثابت کیا اور تمام بیماریوں کو میڈیکل سائنس کے تابع کر دیا۔ یہ اصول پیشگی طور پر اسلام میں موجود تھا۔ اس لئے یہ تغیر خود اسلام کے اصول کو از سر نو زندہ کرنے کے ہم معنی ہے۔ دوسرے قسم کے تغیر کی ایک مثال عورت اور مرد کے درمیان آزادانہ جنسی تعلق کا جدید نظریہ ہے۔ مگر سائنسی تحقیقات اس قسم کی آزادی کو غلط ثابت کر رہی ہیں۔ مثلاً اس طرح کے عمل کے نتیجہ میں خطرناک بیماریوں کا پیدا ہونا۔ چنانچہ عملی تجربہ کے بعد اب خود سیکولر حلقہ میں اس کے خلاف آوازیں اٹھنا شروع ہو گئی ہیں۔ اس بنا پر یقینی ہے کہ اس معاملہ میں دوبارہ اسلام کے اصول کو اختیار کر لیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام تغیر پذیر دنیا میں ایک غیر متغیر حقیقت ہے۔ نظری تجزیہ اور عملی تجربہ دونوں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

مستقبل کی قیادت

ایک تاریخی قانون

مشہور انگریز مورخ آرنلڈ ٹوائن بی ۱۸۸۹ میں لندن میں پیدا ہوا اور ۱۹۷۵ میں یارک شائر میں اس کی وفات ہوئی۔ ۳۵ سال کے لمبے مطالعہ کے بعد اس نے اپنی کتاب مطالعۂ تاریخ (A Study of History) لکھی۔ یہ کتاب بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی آخری جلد ۱۹۶۱ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں پوری انسانی تاریخ کی ۲۶ معلوم تہذیبوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور قوموں کے عروج وزوال کا ایک مربوط فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔

آرنلڈ ٹوائن بی اپنے تاریخی مطالعہ کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جب بھی دنیا میں کوئی نئی تہذیب ظہور میں آتی ہے تو اس کے پیچھے کسی اقلیتی گروہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ دراصل اقلیت ہی ہے جو ان فطری اور تاریخی صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے جو کسی نئے تہذیبی انقلاب کو ظہور میں لانے کے لئے ضروری ہے۔ اس قسم کا تخلیقی انقلاب کبھی کسی اکثریتی گروہ کے ذریعہ وجود میں نہیں آیا۔

آرنلڈ ٹوائن بی کے اس تاریخی فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ --- کسی تہذیب کا ابتدائی مرحلہ ماحول کے چیلنج سے ظہور میں آتا ہے۔ یہ ماحول نہ تو اتنا سخت ہو جو ترقیاتی عمل کو ابھرنے نہ دے اور نہ اتنا موافق ہو کہ وہ تخلیقی روح کو معطل کردے۔ تخلیقی اقلیت اس چیلنج کا جواب دے کر غیر فعال اکثریت کو قیادت فراہم کرتی ہے۔ چیلنج کا جواب دینے کے اس عمل کو مزید تقویت اقلیت کے پیش کردہ حل کی عمومی قبولیت سے ملتی ہے (جو اس کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے):

> The initial stage of a civilization is its growth, brought about by an environmental challenge, neither too severe to stiffle progress nor too favourable to inhibit creativity. Which finds a response among a creative minority that provides leadership to the passive majority. The mechanism of challenge-response is complemented by the general acceptance of and loyalty to the minority's solutions.

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک میں جو گروہ اقلیت میں ہو اس کو عین قانون فطرت کے تحت اکثریتی گروہ کی طرف سے چیلنج کا سامنا پیش آتا ہے۔ یہ صورت حال ایک طرف اقلیتی گروہ کی صلاحیتوں کو بیدار کر کے اس کو فعال بناتی ہے۔ دوسری طرف اکثریتی گروہ چیلنج سے محفوظ ہونے کی بنا پر غیر فعال ہوتا چلا جاتا ہے، اس کو وہ مہمیز نہیں ملتی جو اس کی صلاحیتوں کو بیدار کرے۔ یہ صورت حال مکمل طور پر اقلیتی گروہ کے حق میں ہوتی ہے۔ اب اگر اقلیتی گروہ اتنا کمزور نہ ہو کہ حالات کے دباؤ کے تحت وہ کچل کر رہ جائے تو یہی وہ تاریخی گروہ بن جاتا ہے جو نئی تہذیب پیدا کرے اور انسانیت کو ایک نئے اور بہتر مستقبل کی طرف لے جائے۔

ایک قرآنی آیت

آرنلڈ ٹوائن بی نے جو بات کہی ہے وہ صرف ایک مورخ کا نقطۂ نظر نہیں ہے۔ وہ خود فطرت کا ایک اٹل قانون ہے جس کو ایک مورخ نے تاریخ کے مطالعہ کے ذریعہ دریافت کیا ہے۔ فطرت کا یہ قانون قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے... کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے اذن سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (البقرہ ۲۴۹)

How often has a small group prevailed against a large group by the sanction of God. And God is with the people of patience.

اس آیت میں اذن سے مراد فطرت کا وہ قانون ہے جو خدا نے انسانوں کے درمیان ابدی طور پر قائم کر رکھا ہے۔ اس قانون کو قرآن میں دوسری جگہ عسر کے ساتھ یسر اور یسر کے ساتھ عسر (الانشراح) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ زیر بحث موضوع کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس گروہ کو عددی برتری حاصل ہو وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتا ہے کہ محنت کے بغیر ہی اس کو سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔ یہ نفسیات اس کے اندر ذہنی اور عملی جمود پیدا کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ پوری قوم آرام طلبی اور کاہلی کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کے قابل نہیں رہتی۔

اس کے برعکس جو گروہ عددی اور سماجی حیثیت سے اپنے کو کمتر محسوس کرے وہ عین

فطری قانون کے تحت زیادہ فعال ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ احساس کہ وہ برتر طاقت کی طرف سے چیلنج کی زد میں ہے اس کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ محنت کرے۔ وہ اپنے وسائل کو زیادہ بہتر اور زیادہ منظم طور پر استعمال کرے۔ وہ پیش آمدہ مسائل کا برتر حل (superior solution) دریافت کرے۔ اس قسم کی مسلسل سوچ اس کے اندر وہ چیز پیدا کردیتی ہے جس کو نفسیاتی علماء دماغی طوفان (brainstorming) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اکثریتی فرقہ کے حالات اگر اس کے افراد کو ذہنی جمود میں مبتلا کردیتے ہیں تو اقلیتی فرقے کے حالات اس کے افراد کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر تاریخ کے تمام بڑے بڑے تہذیبی واقعات ہمیشہ اقلیتی گروہ کے ذریعہ ظہور میں آئے۔ اکثریتی گروہ نے کبھی کوئی بڑا تاریخی واقعہ انجام نہیں دیا۔

ہندستانی مسلمان

قرآن میں بیان کردہ مذکورہ قانون اور اس کی تاریخی تصدیق پر غور کیجئے تو ایک نہایت اہم حقیقت دریافت ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس حقیقت کا تعلق ہندستانی مسلمانوں سے ہے۔ موجودہ ہندستانی مسلمان اس کا عین مصداق قرار پاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں ساری صورت حال اچانک بدلی ہوئی نظر آئے گی۔ وہ قوم جس کا معاملہ آج بظاہر ایک المیہ کی صورت میں دکھائی دیتا ہے وہ اچانک ایک طربیہ نظر آنے لگتا ہے۔ ایک قوم جو آج بظاہر ملک کے لئے ایک بوجھ (liability) سمجھی جارہی ہے، وہ ملک کے لئے ایک قیمتی اثاثہ (asset) کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ مزید یہ کہ ہندستانی مسلمانوں کی یہ امید افزا حیثیت صرف ہندستان کے لئے نہیں ہے بلکہ وسیع تر معنوں میں وہ ساری دنیا کے لئے ہے۔

آج کی دنیا کو گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو تمام قوموں میں صرف ہندستانی مسلمان وہ گروہ ہیں جن کے حق میں مذکورہ تاریخی شرطیں پوری ہورہی ہیں۔ وہ یہاں اقلیت میں ہیں مگر اتنی چھوٹی اقلیت نہیں کہ چیلنج کے مقابلہ میں بے بس ہو کر رہ جائیں۔ اقلیت میں ہونے کی بنا پر ایک

طرف انھیں اکثریت کے چیلنج کا سامنا ہے دوسری طرف ان کا ایک بڑی اقلیت ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ اکثریت کے مقابلہ میں یکسر مغلوب ہو کر نہ رہ جائیں۔ اس صورت حال نے ہندستان کے مسلمانوں کو بہترین موافق پوزیشن (advantageous position) میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔

ایک مثال

یہاں میں ایک مثال درج کروں گا جس سے اس معاملہ کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ مثال انڈونیشیا اور ملیشیا کی ہے۔ میں نے اپنے ایک بیرونی سفر کے دوران انڈونیشیا کے ایک سنیئر پروفیسر سے پوچھا کہ انڈونیشیا اور ملیشیا دونوں پڑوسی ملک ہیں مگر ملیشیا کے مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں جو ترقی کی ہے، انڈونیشیا کے مسلمان وہ ترقی نہ کر سکے۔ مذکورہ پروفیسر نے جواب دیا کہ اس کا سبب دونوں کے مختلف حالات میں پایا جاتا ہے۔ ملیشیا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا عددی تناسب تقریباً ففٹی ففٹی کا ہے۔ اس بنا پر وہاں مسلسل چیلنج کی حالت قائم رہتی ہے۔ وہاں کے مسلمان ہر وقت یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے غفلت کی تو فریق ثانی آگے بڑھ جائے گا اور وہ ایک پچھڑا ہوا گروہ بن کر رہ جائیں گے۔ یہ نفسیات ملیشیا کے مسلمانوں کو مسلسل متحرک رکھتی ہے۔ ان کا زیادہ عمل ان کی ترقی کی ضمانت بن گیا ہے۔

انڈونیشیا کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۹۰ فیصد ہے۔ اس عددی اکثریت نے وہاں کے مسلمانوں کے اندر تحفظ کا احساس (sense of security) پیدا کر دیا ہے۔ یہ احساس ان کے لئے جمود کا سبب بن گیا ہے۔ چنانچہ ان کی صلاحیتیں زیادہ بیدار نہ ہو سکیں۔ وہ محنت کش بننے کے بجائے سہولت پسندی کی زندگی کے عادی بن گئے۔ اور جس قوم کا یہ حال ہو جائے وہ کبھی کوئی بڑی ترقی نہیں کر سکتی۔

برصغیر ہند میں اگر اس اصول کو منطبق کیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہو گا کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمان گویا انڈونیشی مسلمانوں کے مانند ہیں، اور انڈیا کے مسلمان ملیشیائی مسلمانوں کے

مانند...... بلکہ شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انڈیا کے مسلمان اس معاملہ میں ملیشیا کے مسلمانوں سے بھی زیادہ بہتر پوزیشن میں ہیں۔ کیونکہ ملیشیائی مسلمانوں کو ایک مساوی گروہ کی طرف سے چیلنج درپیش ہے، جب کہ انڈیا کے مسلمانوں کو عددی اعتبار سے ایک برتر گروہ کا سامنا کرتے ہوئے زندگی کا ثبوت دینا ہے۔ اس فرق کی بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انڈیا کے مسلمانوں میں مقابلہ کی اسپرٹ جتنی زیادہ بیدار ہوگی وہ اس سے زیادہ ہوگی جو ملیشیا کے مسلمانوں میں بیدار ہوتی ہے۔

ان حالات کی بنا پر ہندستانی مسلمان ایک عظیم امکان کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ امکان کہ وہ فطرت کے اشارہ کو سمجھیں اور اس کو استعمال کرکے نہ صرف ہندستان کے لئے بلکہ پوری دنیا کے لئے ایک نئے دور کے نقیب بن جائیں۔

بیسویں صدی کا جائزہ

بیسویں صدی میں دنیا کے نقشہ پر کئی قومیں ابھریں جنھوں نے عالم انسانی کی قیادت کا رول ادا کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے تین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔۔۔ سوویت یونین، امریکہ، ہندستان۔ مگر یہ تمام طاقتیں یا تو عملاً ناکام ہوچکی ہیں یا وہ ناکامی کے کنارے کھڑی ہوئی ہیں۔

۱۹۱۷ میں روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا، اس کے بعد سوویت یونین کی شکل میں اس کا ایک عظیم امپائر بن گیا۔ تقریباً ۷۵ سال تک شان وشوکت دکھانے کے بعد اس کا یہ حال ہوا کہ ۱۹۹۱ میں وہ ریت کے محل کی طرح ٹوٹ کر گر گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نظام سرتاسر غیر فطری بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ خدا نے اس دنیا کا نظام مسابقت (Competition) کے اصول پر قائم کیا ہے۔ مگر کمیونسٹ امپائر نے اس کو ختم کرکے ریاستی کنٹرول کی مصنوعی بنیاد پر زندگی کا نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ نظام اول دن ہی سے قابل عمل نہ تھا۔ کچھ دن تک وہ جبر اور پروپیگنڈہ کے زور پر چلتا رہا۔ اس کے بعد وہ خود اپنی داخلی کمزوری کی بنا پر منہدم ہوگیا۔

امریکی نظام تقریباً دو سو سال سے بدستور ابھی تک چلا جارہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

امریکہ کے ابتدائی دانشوروں نے اس کو صحیح فکری بنیاد یعنی مسابقت کے اصول پر قائم کیا۔ تاہم امریکی نظام میں اول دن سے ایک کمزوری شامل تھی۔ وہ یہ کہ یہ نظام مذہب اور سیاست کی تفریق کے اصول پر قائم کیا گیا۔ اس قسم کی تفریق اصولی طور پر غلط ہے مگر وہ کم از کم اقتصادی پہلو سے ایک قابل بقا (sustainable) نظام تھا۔ اس لئے وہ ظاہری ڈھانچہ کے اعتبار سے چلتا رہا اور بظاہر اب بھی چلا جارہا ہے۔

تاہم گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ امریکی نظام اب آہستہ آہستہ زوال کا شکار ہو رہا ہے۔ اس زوال کا نمایاں مظاہرہ ۹۸۔۱۹۹۹ میں موجودہ امریکی صدر بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی (Monica Lewinsky) کے واقعہ کی صورت میں ہوا۔ مونیکا لیونسکی واشنگٹن کے وہائٹ ہاؤس کی ایک نوجوان کارکن تھی۔ کلنٹن نے اس سے خفیہ جنسی تعلق قائم کر لیا۔ جب یہ راز افشا ہو گیا تو صدر کلنٹن نے دو اور غلطیاں کیں۔ ایک دروغ حلفی (perjury) اور دوسرے انصاف میں رکاوٹ ڈالنا۔ ۱۳ ماہ تک اسمبلی کی سطح پر کیس چلتا رہا یہاں تک کہ ۱۲ فروری ۱۹۹۹ کو ممبران کی کثرت رائے سے کلنٹن کو بری کر دیا گیا۔

اس کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ امریکی عوام کی تقریباً ۷۵ فیصد تعداد صدر کلنٹن کے مواخذہ (impeachment) کے خلاف تھی۔ امریکی عوام کی رائے یہ تھی کہ صدر کلنٹن نے امریکی اقتصادیات کو بہتر بنایا ہے۔ ایسی حالت میں اگر ان کی ذاتی زندگی غیر اخلاقی ہو تو ہمارے لئے وہ قابل لحاظ نہیں۔ امریکی عوام کے اس رجحان کی بنا پر صدر کلنٹن کے خلاف مواخذہ کی تحریک ناکام ہو گئی۔

۲۰۰ سال پہلے امریکہ نے سیاست کو مذہب سے جدا کیا تھا۔ اب یہ ثابت ہوا کہ امریکی قوم نے مزید آگے بڑھ کر اخلاقی اقدار (moral values) کو بھی اپنی سیاسی اور قومی زندگی سے الگ کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ یہ دوسری علیحدگی اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی ہے کہ نہ صرف امریکی عوام بلکہ ساری دنیا کے لوگوں نے اس کو جان لیا۔ بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کا یہ قصہ ایک ایسے

زمانے میں پیش آیا جب کہ دنیا میڈیا اور انٹرنٹ کے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ چنانچہ پورے ایک سال تک یہ معاملہ ہر روز لوگوں کے سامنے آتا رہا۔ دنیا میں بسنے والا تقریباً ہر شخص اس کو جان گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ میں اخلاقی اقدار اور سیاست کے درمیان یہ جدائی خاموش عمل کے طور پر نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ اعلان اور اشتہار کے ساتھ ہوئی ہے۔ یہ برائی امریکی سماج میں اگر خاموش عمل کے طور پر ہوتی تو وہ امریکہ کے لئے کچھ اور زندگی کی ضمانت بن سکتی تھی جیسا کہ قدیم بادشاہوں کے ساتھ پیش آیا۔ مگر اس کو علی الاعلان اختیار کرکے امریکہ نے اپنے زوال کے سفر کو بہت زیادہ تیز کر دیا ہے۔ کوئی بھی نظام اخلاقی صفات سے محروم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور امریکہ یقینی طور پر اس تاریخی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

تیسری مثال ہندستان کی ہے۔ ہندستان میں تقریباً سو سال کی جد وجہد کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو آزادی آئی۔ سوامی وویکا نند نے کہا تھا کہ آزادی کے بعد ہندستان ورلڈ لیڈر بنے گا۔ مگر عملاً کیا ہوا۔ یہ ملک لمبی مدت سے اونچی ذات اور نیچی ذات کے دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ حالات سے فائدہ اٹھا کر اونچی ذات والوں نے آزادی کو ہائی جیک (hijack) کر لیا۔ یہی لوگ آزادی کے بعد سے مسلسل ملک کے اوپر حکومت کر رہے ہیں۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ وہ ملک کو ایسا نظام دینے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں جو مہاتما گاندھی کے الفاظ میں "ہر آنکھ کے آنسو پوچھنے والا ہو"۔

اس ناکامی کا سبب بالکل واضح ہے۔ ملک کے اونچے طبقہ (uppercast) کے پاس جو آئیڈیالوجی ہے وہ ایک ایسی محدود آئیڈیالوجی ہے جو پوری انسانیت کو اپنے دامن میں نہیں لیتی۔ اس آئیڈیالوجی میں اونچی ذات والوں کے لئے تو باعزت جگہ ہے۔ مگر نیچی ذات اور غریب عوام کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ اس آئیڈیالوجی کے مطابق، ہر آدمی جس حال میں ہے وہ خود اس کی اپنی ہی پچھلی زندگی کا لازمی اور ناقابل تقسیم نتیجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ غریب

اور مظلوم ہیں وہ فطرت کے جبری نظام کے تحت خود اپنے ماضی کے کردار کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ انھیں زندگی کے آخری لمحہ تک اس نتیجہ کو بہر حال بھگتنا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی ملک کے نصف سے زیادہ حصہ کو اونچی ذات کے حکمرانوں کی نظر میں ایک ایسا کیس بنادیتی ہے جس پر رحم کرنا ضروری تو کیا ممکن بھی نہیں۔

پیدائش کے اس جبری نظریہ نے اونچی ذات کے حکمرانوں کو جو آئیڈیالوجی دی وہ ایک محدود آئیڈیالوجی تھی۔ اس محدود آئیڈیالوجی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان حکمرانوں کے دل میں وسیع تر انسانیت کے لئے نرم گوشہ پرورش نہ پاسکا۔ ان کے لئے آزادی صرف اس بات کا موقع بن گئی کہ وہ سب کچھ اپنے لئے جمع کرلیں اور دوسروں کے لئے کچھ نہ چھوڑیں، کیونکہ دوسرے لوگ اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ وہ محروم رہ کر اپنے پچھلے دور حیات کی غلطیوں کی سزا پائیں اور اسی حال میں مر کر وہ اس دنیا سے چلے جائیں۔

نئے گروہ کی ضرورت

حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آخر میں یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ قیادت کی دعویدار تمام قومیں مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہیں۔ اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے کہ ایک نیا اور تازہ دم گروہ ابھرے جو اس خلا کو پر کرے، جو آنے والی اکیسویں صدی کو حقیقی معنوں میں انسان کے لئے ایک نئی اور بہتر صدی بنادے۔

میرے اندازے کے مطابق یہ نیا گروہ ہندستانی مسلمانوں کا گروہ ہے۔ تقریباً ۶۰ مسلم قوموں میں، ہندستانی مسلمان استثنائی طور پر اس خصوصیت کے مالک ہیں کہ وہ انڈونیشیا کو چھوڑ کر سب سے بڑے عددی گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک اکثریتی گروہ کی طرف سے چیلنج کا سامنا کر رہے ہیں۔ چیلنج انسانی ترقی کی لازمی شرط ہے، اور یہ شرط موجودہ دور میں صرف ہندستانی مسلمانوں کے حق میں پوری ہو رہی ہے۔ موجودہ ہندستانی مسلمان ہی اس حالت میں ہیں کہ قانون فطرت کے تحت ان کے اندر وہ تخلیقی اور تعمیری اوصاف پیدا ہوں جو کسی قوم کو

اس دنیا میں قیادت کا اہل بناتے ہیں۔

علامہ اقبال اور مسٹر محمد علی جناح نے غالباً ہندستانی مسلمانوں کو اسی تعمیری رول کے لئے کھڑا کرنا چاہا مگر انھوں نے اس کے لئے جو تدبیر اختیار کی وہ درست نہ تھی۔ انھوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ پاکٹ (پاکستان) بنانا ان کے لئے اس قسم کا موقع دینے والا ثابت ہوگا مگر برعکس طور پر اس تدبیر نے ان مسلمانوں کو چیلنج کے ماحول سے محروم کر دیا، جب کہ چیلنج کا ماحول ہی کسی بڑے انسانی عمل کے ظہور میں آنے کی لازمی شرط ہے۔

تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان کے کچھ مسلم لیڈروں نے اس سلسلہ میں ایک نیا منصوبہ بنایا۔ انھوں نے چاہا کہ مسلم۔ دلت اتحاد قائم کریں اور اس طرح مسلمانوں کو زیادہ طاقت ور حیثیت دے کر انھیں اس قابل بنائیں کہ وہ ملک میں کوئی بڑا رول ادا کر سکیں۔ مگر یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی پہلی اور بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ مسلم۔ دلت اتحاد کا مقصد صرف مسلمانوں کے لئے تحفظ فراہم کرنا تھا۔ وسیع تر ملکی مفاد اس کا حقیقی نشانہ نہیں تھا۔ اور اس قسم کی محدود اسکیم کسی بھی مشترک سماج میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس دنیا میں وہی منصوبہ کامیاب ہوتا ہے جس میں دوسروں کی خیر خواہی شامل ہو۔ محض اپنی خیر خواہی کی بنیاد پر بنایا ہوا منصوبہ قانون فطرت کے خلاف ہے اس لئے اس کا کامیاب ہونا بھی اس دنیا میں ممکن نہیں۔

لائحۂ عمل

حالات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہندستان میں وہ اسٹیج مکمل طور پر تیار ہو چکا ہے جس کو استعمال کر کے مسلمان اپنا تاریخی رول ادا کر سکیں۔ تاہم کوئی بڑا تاریخی رول صرف اس وقت ادا کرنا ممکن ہوتا ہے جب کہ اس کی تمام ضروری شرائط پوری کی گئی ہوں، شرائط کی تکمیل کے بغیر اسباب کی اس دنیا میں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

۱۔ میرے نزدیک اس معاملہ میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مسلمان اس پورے معاملہ کو خالص انسانی نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ وہ جو کچھ کریں عمومی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت

کریں۔ اپنی گروہی برتری کا قیام یا اپنے حقوق کا حصول جیسے ذاتی مقاصد کو لے کر اگر کوئی جدوجہد شروع کی گئی تو پیشگی طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کبھی مثبت یا قابل لحاظ نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس دنیا میں کسی انسان کی سب سے بڑی طاقت دوسروں کے حق میں خیر خواہی ہے۔ اسی طرح کسی انسان کی سب سے بڑی کمزوری اس کی خود غرضی ہے۔ مسلمانوں کے اندر یہ اخلاقی اور روحانی اسپرٹ پیدا کرنا مجوزہ مشن کا سب سے پہلا نکتہ ہوگا۔

۲۔ موجودہ حالات میں دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ بڑے پیمانہ پر ہندو مسلم ڈائیلاگ شروع کیا جائے۔ کھلے ذہن کے تحت تمام فکری اور نظریاتی پہلوؤں پر گفتگو ہو۔ یہ کام مناظرہ کے انداز میں نہیں ہونا چاہیئے بلکہ خالص سائنٹفک انداز میں ہونا چاہیئے، یعنی وہی انداز جو آج بھی مذہب کے سوا دوسرے علمی موضوعات میں جاری ہے۔

۳۔ اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ مسلمان صحت مند مقابلہ کے میدان میں پوری طرح داخل ہو جائیں۔ شکایت اور احتجاج اور مانگ اور مطالبات کے طریقہ کو مکمل طور پر ترک کر دیں۔ وہ رعایت حاصل کر کے جینے کے بجائے قابلیت کا ثبوت دے کر ملک میں اپنی جگہ بنائیں۔ تعلیم، تجارت، انڈسٹری، تمام سماجی اداروں اور پروفیشنل شعبوں میں امتیازی لیاقت پیدا کر کے آگے بڑھیں۔

۴۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں اقلیتی گروہ کے لئے جس غلبہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے اس کی لازمی شرط، آیت کے مطابق، صبر ہے۔ قرآن کا یہ بیان حتمی طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ فطرت کے مذکورہ قانون کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ لوگوں کے اندر صبر و تحمل کا مادہ ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پیش آمدہ صورت حال میں فوری ردعمل کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے بلکہ سوچا سمجھا طریقہ اختیار کیا جائے۔ سوچا سمجھا طریقہ اختیار کرنے کے لئے ہمیشہ وقت درکار ہوتا ہے۔ تاکہ آدمی ٹھنڈے ذہن کے ساتھ

معاملہ کو سمجھے۔ وہ تحقیق اور مشورہ کے مراحل سے گزر کر کوئی گہری رائے قائم کرے۔ اس طرح صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے اقدام سے بچے اور منصوبہ بند عمل کا طریقہ اختیار کرے۔ جو لوگ مسلمانوں کو مثبت رول ادا کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں ان پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کے اندر صابرانہ مزاج پیدا کریں۔ وہ ان کو جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی کی تعلیم دیں۔

۵۔ کوئی بھی کام کرنے کے لئے اس کے مطابق بنیاد (base) درکار ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں جو رول ادا کرنا ہے اس کے لئے بھی یہی ضروری تیاری درکار ہے۔ اور وہ بنیاد تعلیم اور کردار ہے۔ جو لوگ یہ درد رکھتے ہیں کہ مسلمان اس ملک میں اپنا مطلوب تعمیری کردار ادا کریں انھیں مہم کے انداز میں یہ کوشش شروع کر دینا چاہیئے کہ مسلمان صدفی صد تعلیم یافتہ بن جائیں۔ اس تعلیمی نشانہ کو پورا کئے بغیر آگے کا کام نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ انھیں دوسری مہم یہ جاری کرنا ہے کہ مسلمان اعلیٰ کردار کے حامل بنیں۔ مسجد اور مدرسہ سے لے کر اخبارات ورسائل تک ہر ذریعہ کو اس مقصد کے لئے پوری طرح استعمال کیا جانا چاہیئے۔ تعلیم آدمی کو باشعور بناتی ہے۔ اور اخلاق و کردار کے ذریعہ آدمی اس کا اہل بنتا ہے کہ وہ قابل اعتماد طور پر دنیا کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکے۔

٦۔ آزادی کے بعد ملک میں جو سماج بنا وہ نفرت اور تشدد کا سماج تھا۔ اس منفی فضا میں ملکی تعمیر کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے مہاتما گاندھی نے آزادی (۱۹۴۷) کے وقت کہا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل کر امن اور ہم آہنگی کے ساتھ رہنا ہو گا۔ ورنہ میں اسی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا:

Hindus and Muslims should learn to live together in peace and amity otherwise I will die in the attempt.

بد قسمتی سے ابھی تک نفرت اور کشیدگی کی یہ فضا ختم نہ ہو سکی۔ یہ فضا ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے اور پورے ملک کے لئے سخت مہلک ہے۔ اس کی موجودگی میں ملک کے اندر کسی

تعمیری منصوبہ کی تکمیل ممکن نہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ ہر ممکن کوشش کر کے اس کو ختم کیا جائے۔ملک میں قومی یک جہتی اور برادرانہ محبت کا ماحول پیدا کیا جائے۔اس کے بعد ہی یہاں کوئی حقیقی ترقیاتی کام کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس وقت جو تلخی پائی جاتی ہے اس کا بڑا سبب وہ غلط فہمیاں ہیں جو مذہب کی نسبت سے پیدا ہوتی ہیں۔ان غلط فہمیوں کو دور کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔اس مقصد کے لئے ضرورت ہے کہ وسیع پیمانہ پر اسلام کے صحیح تعارف کی مہم جاری کی جائے۔ مختلف زبانوں میں اسلام کے مختلف موضوعات پر مثبت انداز کی کتابیں لکھ کر انھیں بڑے پیمانہ پر غیر مسلموں کے درمیان پھیلایا جائے۔

۸۔ کوئی قوم صحیح رول صرف اس وقت ادا کر سکتی ہے جب کہ اس کو صحیح قیادت حاصل ہو جائے مگر صحیح قیادت کا تعلق خود قیادت سے زیادہ قبولیت قیادت کی صلاحیت سے ہے۔ قوم کے اندر یہ مزاج ہونا چاہئے کہ وہ تعمیری قیادت اور استحصالی قیادت کے فرق کو سمجھ سکے۔ وہ حقیقت پسندانہ کلام اور جذباتی کلام کو پہچانے ۔ جس قوم میں یہ استعداد نہ ہو وہ ہمیشہ استحصالی قیادت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ مسلم عوام میں یہ مزاج پیدا کرنا بھی بہت ضروری ہے۔اس کے بغیر کسی گہرے منصوبہ کے لئے مسلمانوں کو متحرک نہیں کیا جاسکتا۔

۹۔ سیاست کے میدان میں مسلمانوں کا رول اب تک منفی رائے دہندگی (negative voting) کا رہا ہے۔یعنی کسی بنا پر جس سے انھیں ناراضگی ہو جائے اس کے خلاف ووٹ دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنا۔اس قسم کی منفی سیاست نہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے اور نہ ملک کے لئے۔ جمہوریت دراصل طاقت میں اشتراک (power sharing) کی سیاست کا نام ہے۔ ہندستان میں مسلمان مرکزی پارلیمنٹ کی تقریباً ۱۰۰ سیٹوں پر فیصلہ کن بن سکتے ہیں۔اس اعتبار سے اگر وہ اپنے ووٹ کو درست طور پر استعمال کریں تو ملک کے سیاسی نظام میں وہ فیصلہ کن تعمیری رول ادا کر سکتے ہیں۔ مگر ابھی تک یہ ممکن نہ ہو سکا۔ ضرورت ہے کہ ان

کے اندر صحیح سیاسی شعور پیدا کیا جائے تاکہ وہ جذباتی سیاست کے بجائے تعمیری سیاست کا طریقہ اختیار کر سکیں اور یہاں کے سیاسی مواقع کو مفید طور پر استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں۔

۱۰۔ مسلمانوں کو اس ملک میں مثبت سیاست کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ حالات کے اعتبار سے اس کی ایک ابتدائی تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ وہ مسلم۔ کرشچین محاذ بنانے کی کوشش کریں۔ اس محاذ کا مقصد اپنے حقوق کا حصول نہیں ہو گا بلکہ یہ ہو گا کہ وہ ملک کی عمومی تعمیر میں اپنا مثبت رول زیادہ مضبوط اور مستحکم طور پر ادا کر سکیں۔ اگر حقیقی معنوں میں یہ مسلم۔ کرشچین محاذ بن جائے تو اس کے بعد یقینی طور پر دلت بھی اس میں شامل ہو جائیں گے۔ حتی کہ ملک کے دوسرے کئی طبقے بھی۔ یہ کام اگر خالص تعمیری انداز میں کیا جائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت یہ محاذ ملک میں صالح سیاسی قیادت کا خلا بھی پر کرنے کے قابل ہو جائے۔

ISBN 81-87570-10-5